Phone 80800

قرآنی نظامِ رُبوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1965

23rd March 1940

I have placed before you the task that lies ahead of us. Do you realise how big and stupendous it is? Do you realise that you cannot get freedom or independence by mere arguments? I should appeal to the intelligentsia. The intelligentsia in all countries in the world have been the pioneers of any movements for freedom. What does the Muslim intelligentsia propose to do? I may tell you that unless you get this into your blood, unless you are prepared to take off your coats and are willing to sacrifice all that you can and work selflessly, earnestly and sincerely for your people, you will never realise your aim.

Quaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah.
(Presidential address)

The aim still remains unrealised !

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ ۔ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

بدلِ اشتراک
پاک و ہند سے
سالانہ ــــ دس روپے
غیر ممالک سے
سالانہ ــــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاک و ہند سے
ایک روپیہ

ٹیلیفون نمبر ۸۰۰۰۰
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

جلد ۱۸ ــ مارچ سنہ ۱۹۶۵ء ــ نمبر ۳

فہرست مضامین

لمعات ــــ ۲
باب المراسلات ــــ ۱۰
ان سے اسلامی قوانین بنوایئے ! ــــ ۲۷
دنیا میں جہنم کی زندگی ــــ خان عبدالحکیم خان) ــــ ۳۳
رابطۂ باہمی ــــ ۳۹
میلاد النبی ــــ (علامہ تمنا عمادی) ــــ ۴۱
بازیچۂ اطفال ــــ ۵۴
نقد و نظر ــــ ۶۷
بچوں کا صفحہ ــــ ۷۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری!
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں۔

شروع فروری میں، لاہور میں، ایک بین الاقوامی ادبی اور ثقافتی مجلسِ مذاکرہ (سیمینار) کا انعقاد ہوا جس میں افریقہ اور ایشیا کی بہت سی اقوام کے نمائندگان شامل تھے۔ اسی جہت سے اسے "افریشیائی سیمینار" کے مختصر نام سے پکارا گیا تھا۔ اس مجلسِ مذاکرہ کا افتتاح صدرِ مملکتِ پاکستان، محترم محمد ایوب خاں صاحب نے کیا۔ انہوں نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں بعض ایسے اہم نکات پیش کئے جو ملک کے اربابِ دانش و بصیرت کے لئے درخورِ غور و فکر ہیں۔ انہوں نے کہا!

ہم اپنی آزادی سے کیا فائدہ اٹھاتے ہیں، اس کا مدار اس بات پہ ہے کہ فکر و شعور کی دنیا میں ہمارا طرزِ عمل کیا ہے۔ اس لئے کہ جو عمل کسی قوم کو ترقی کی راہوں پر لے جا سکتا ہے اس کے محرک ہمیشہ افکار و تصورات ہوتے ہیں۔

یہی وہ حقیقت تھی جسے علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود — کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا!

اس کے بعد انہوں نے "قدیم و جدید کی کشمکش" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

ہم میں سے جو لوگ قدیم تہذیب کے علمبردار ہونے کے مدعی ہیں، وہ بعض اوقات

اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ تہذیبِ مغرب کی کشش و جاذبیت کے مقابلہ کرنے کا طریقہ یہ ہے ـــ یعنی اُس تہذیب کی صنعت گری کا مقابلہ کرنے کا جس کی بنیاد سائنس اور ٹیکنالوجی، علم الاشیاء پر ہے ـــ کہ ہم اس کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنے ماضی کے گھروندے میں سر دے کر بیٹھ جائیں۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ جس آسانی سے آجکل انسانی خیالات اور خود انسان، ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں، اس کے پیشِ نظر کسی کا اپنے آپکو ان خیالات سے غیر متاثر رکھنا بہت مشکل ہے۔ اب کوئی ملک بھی دنیا کے عالمگیر مؤثرات و تحریکات سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جو بات اچھی نظر آئے اسے اپنا یا نہ جائے، خواہ وہ کہیں سے ملے۔ اور جو ناخوشگوار ہو اسے مسترد نہ کر دیا جائے۔ ہمارا فائدہ اسی میں ہے کہ ہم اپنی تہذیب و تمدن کے بنیادی عناصر کو قائم رکھتے ہوئے ان میں، اور ان ترقی پذیر عناصر میں امتزاج پیدا کریں، جو دوسری تہذیبیں پیش کریں۔ یہ بات صرف اسی قسم کے امتزاج ہی سے ممکن ہے کہ ہم ایک طرف اپنی انفرادیت اور تشخص کو برقرار رکھ سکیں اور دوسری طرف، اپنے لوگوں کو اس کے لئے تیار کر سکیں کہ وہ عصرِ حاضر کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اتر سکیں تاکہ ہم اس قابل ہو سکیں کہ ہم اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکیں۔ اپنا معیارِ زندگی بلند کر سکیں اور اپنی قوم کو ایسی زندگی عطا کر سکیں جو افراد و معاشرہ کو طبیعی ضروریاتِ زندگی کی احتیاج اور ذہنی جمود سے نجات دلا سکے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا:

زندگی کے گہوارے میں، افراط و تفریط کی طرف چلے جانا بڑا آسان، اور ایک خوشگوار اعتدال کو قائم رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جو لوگ ماضی میں کھوئے رہنا پسند کرتے ہیں، وہ افکارِ نو اختیار کرنے کی مشقتوں سے گھبراتے ہیں۔ یہ عام انسانی فطرت ہے ـــ نئے افکار اور جدید قالب، وضعِ حمل کے سے درد اپنے ساتھ لاتے ہیں ـــ مگر درد زہ کے بغیر بچہ پیدا نہیں ہوتا ـــ دوسری طرف وہ لوگ جو اپنے ماضی سے یکسر منہ موڑ لیتے ہیں زندگی کے چڑھاؤ کی طرف جانے کے بجائے اس کی عام لہروں کے ساتھ بہ جانے میں آسانی دیکھتے ہیں۔ جو قومیں اپنی زندگی کے دورِ جدید میں داخل ہو رہی ہیں، جہاں ان کے لئے اپنی آزادی کا برقرار رکھنا ضروری ہے؛ وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل میں آزاد ہوں۔

اس کے بعد انہوں نے اس نکتہ کو بیان کیا ہے جو اس باب میں محوری اور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا۔

> مذہب کے میدان میں یہ دقت خصوصیت سے پیش آتی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور کے ساتھ اس کی مطابقت کیسے کی جائے۔ اکثر مذاہب میں رسوم اور ظواہر کے دھندلکوں میں چھپے رہنے کا رجحان پایا جاتا ہے اور ان کے علمبردار عصر سائنس کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے تصور پر ناک بھنوں چڑھاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہماری نئی پود مذہب سے دور بھاگتی چلی جا رہی ہے۔ میں مذہبی امور کا ماہر نہیں لیکن یہ میرا پختہ ایمان ہے کہ مذہب کے بنیادی اصول مستقل اور غیر متبدل ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ نہ ہی ان میں تبدیلی کرنی چاہیئے۔ لیکن ان اصولوں کا اطلاق زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ہونا چاہیئے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے مذہب کی گرفت بھی ڈھیلی نہیں پڑیگی اور اس کے متبعین ترقی اور مسابقت سے ہمدوش رہیں گے۔

علاوہ بریں انسان فطرۃً " روایت پرست واقع ہوا ہے۔ اور ایک حد تک یہ ٹھیک بھی ہے۔ اسلئے کہ اس سے ان کا تعلق ماضی کے ساتھ اس طرح وابستہ رہتا ہے کہ وہ حال کے معاملات کو سنبھالنے اور مستقبل کے لئے تیار ہو جانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ لیکن روایت پرستی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک روایت پرستی جمود سے پیدا ہوتی اور بزدلی پہ پرورش پاتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس کی بنیاد اس احساس پر ہوتی ہے کہ یہ ایک بہتر زندگی کی طرف لے جانے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی روایت پرستی ہے جس سے ہمیں اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی بڑی ضرورت ہے اس لئے کہ یہ اس جذبہ کی پیداوار ہے کہ انسان اپنی فکری صلاحیتوں سے قطعاً کام نہ لے، حالانکہ یہ فکری صلاحیت ہی ہے جس کی رو سے انسان دیگر حیوانات سے ممیز اور ممتاز ہوتا ہے۔ یہ امر موجب حیرت ہے کہ اکثر انسان اس صلاحیت سے کام لینے سے نفرت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں تاریخ انسانیت میں یہ (تعجب انگیز اور افسوسناک) منظر دکھائی دیتا ہے کہ جن لوگوں نے تقلید کی بندھی سلوں کو توڑ کر، فکر و خیال کی نئی راہیں تراشنے کی جرأت کی، دوسرے لوگوں نے ان کی سخت مخالفت کی اور انہیں طعن و تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔ انہیں کافر و مرتد اور ملحد و بے دین قرار دیا گیا۔ لیکن ان میں سے جن افراد نے مثبت اور تعمیری فکر پیش کی تھی، مر جانے کے بعد وہ بڑی عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ اس

سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں اپنے ارباب فکر و دانش کی "پرستش" اس وقت کرنی چاہیئے جب وہ ہنوز زندہ ہوں اور اس طرح ان کی فکری استعداد سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

(بحوالہ پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۱۱ [illegible])

قبل اس کے کہ ہم اس مقصد کی طرف آئیں جس کے لئے ہم نے ان اقتباسات کو پیش کیا ہے، دو ایک تبصرہ طلب نقاط کا سامنے لانا ضروری ہے۔

(۱) قدیم و جدید کی کشمکش کے سلسلہ میں خطاب میں کہا گیا ہے کہ ہمیں جو بات اچھی نظر آئے (whatever is good) اسے لے لینا چاہئے اور جو ناخوشگوار (unwholesome) ہو اسے مسترد کر دینا چاہئے۔ اس سلسلہ میں یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ "اچھا" (GOOD) کسے کہا جائے اور ناخوشگوار کسے قرار دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے نہ تو کسی فرد کے ذاتی ذوق اور پسند کو معیار قرار دیا جا سکتا ہے، نہ ہی کسی قوم کے میلانات و رجحانات کو میزان ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اس طرح تو (GOOD) اور (BAD) اضافی بنکر رہ جاتے ہیں۔ مطلق (ABSOLUTE) نہیں رہتے۔ ہمارے پاس خیر اور شر۔ حق اور باطل۔ اچھے اور برے کا معیار خدا کی کتاب میں دی ہوئی مستقل اقدار ہیں۔ جو ان کے مطابق ہے وہ اچھا ہے۔ جو ان کے خلاف ہے وہ ناخوشگوار ہے۔

(۲) پھر کہا گیا ہے کہ ہم اپنی تہذیب و تمدن کے بنیادی عناصر کو قائم رکھتے ہوئے دوسری تہذیبوں کی اچھی باتوں کو اپنے اندر ضم کریں۔ اس سلسلہ میں ضروری ہے کہ ہم اپنی تہذیب و تمدن کے بنیادی عناصر کی وضاحت کریں۔ اور یہ نہایت آسان ہے۔ ہماری تہذیب کے جو گوشے مستقل اقدار کے مظہر ہیں وہ باقی رکھنے کے قابل ہیں۔ جو ان کے خلاف ہیں وہ چھوڑ دینے کے لائق۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں "قدیم اور جدید" کا کوئی جھگڑا ہی نہیں۔ خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار نہ قدیم ہوتی ہیں نہ جدید۔ وہ ہمیشہ زندہ و پائندہ، قائم و دائم اور یکساں رہتی ہیں۔ نہ وہ مرور زمانہ سے قدیم ہو جاتی ہیں، اور نہ ہی عصر حاضر میں ان پر عمل کرنے سے وہ جدید کہلا سکتی ہیں۔

(۳) یہ کہا گیا ہے کہ لوگ افکار نو اختیار کرنے کی مشقتوں سے گھبراتے ہیں۔ اور یہ عام انسانی فطرت ہے۔ —— یہ انسانی فطرت نہیں بلکہ سہل انگاری کی پیدا کردہ عادت ہے۔ فطرت ناقابل تغیر ہوتی ہے۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ جو صاحب اختیار و ارادہ ہو اس کی فطرت نہیں ہوتی۔

(۴) یہ کہا گیا ہے کہ اکثر مذاہب میں رسوم وظواہر کے دھندلکوں میں چھپے رہنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ "اکثر مذاہب" نہیں۔ مذہب کوئی بھی ہو، وہ رسوم و ظواہر کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس لئے مذہب اور مذہب میں امتیاز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اسلام کو مذہب نہیں کہا۔ دین کہا ہے۔ دین، قوانین و اقدار کا ضابطہ ہوتا ہے۔ مذہب رسوم وظواہر کا مجموعہ۔ ان دونوں میں بنیادی فرق ہے۔

اب ہم اس مقصد کی طرف آتے ہیں جس کے لئے ہم نے ان اقتباسات کو پیش کیا ہے۔ صدر مملکت محترم محمد ایوب خاں صاحب کی طرف سے ان خیالات کا اظہار کوئی نئی بات نہیں۔ وہ اپنے ان افکار و خیالات کو اس سے پیشتر کئی ایک مواقع پر شرح وبسط سے پیش کر چکے ہیں۔ یہ ان خیالات کی اہمیت کا احساس ہے جو انہیں ان کے بار بار دھرانے پر مجبور کرتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم بھی انہیں اپنے ہاں بار بار دھراتے رہتے ہیں۔ دین ہے ہی "مستقل اور تغیر پذیر" کے حسین امتزاج کا نام۔ "مستقل" وہ اصول و قوانین جو قرآن کریم میں دیئے گئے ہیں۔ اور "تغیر پذیر" وہ طرق و اسالیب اور تفاصیل وجزئیات جن کی رو سے ان اصولوں پر مختلف زمانوں میں عمل کیا جائے۔ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے اور ان کی جزئیات زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ بدلتی رہیں گی۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو صدر محترم کے یہ خیالات دین کے مفہوم و مقصود کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔

لیکن یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی انہی خیالات و افکار کو پیش کیا اور نہایت حسین و بلیغ انداز سے پیش کیا۔ لیکن وہ صرف متفکر تھے اور ان کے پاس ایسی قوت نہیں تھی جس سے وہ ان خیالات کو معاشرہ میں عملاً نافذ کر سکتے۔ انہیں اس حقیقت کا اعتراف و احساس تھا کہ

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

یہ محض ایک حقیقت کا اظہار نہیں بلکہ (ہم تو سمجھتے ہیں کہ) یہ ان کے قلب درد آگیں کی اس شدتِ اضطراب کا بھی اظہار ہے جو اس احساس سے پیدا ہوتا تھا کہ ان کے پاس (بلکہ اسوقت ملت کے پاس) وہ قوت کیوں نہیں جو ان افکار کو ایک عملی حقیقت بنا سکے۔ اسی کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصور دیا تھا۔ قائداعظمؒ نے اس مقصد کیلئے پاکستان حاصل کیا لیکن انہیں دستِ قضا نے اتنی فرصت نہ دی کہ وہ ان افکار کو اس حاصل کردہ قوت کی رُو سے عملی پیکر عطا کر دیتے۔ ان کے بعد یہ افکار ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اب خدا خدا کر کے یہ قوت ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں آئی ہے جو ان افکار کو اپنے ایمانِ محکم کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے ——— اور پہلے دن سے پیش کر رہا ہے یعنی اب فکر بھی موجود ہے اور قوتِ نافذہ بھی موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت منتظر نہایں مجازیں سامنے نہیں آرہی۔ "کلیمی" ابھی تک کارِ بے بنیاد ہی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

صدر محمد ایوب خاں جس شد و مد سے ان خیالات کو دہراتے چلے آ رہے ہیں، اور جس جذبہ و کیفیت سے انہیں پیش کرتے ہیں، وہ اس حقیقت کی شہادت بن سکتے ہیں کہ ان کی نیّت نیک ہے اور وہ یہ باتیں کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر نہیں کرتے۔ سیاسی مصلحت کا تو بلکہ تقاضا یہ تھا (اور ہے) کہ وہ فقط قدامت پرستی کا مسلک پیش کرتے اور کسی قسم کی جدت پسندی کا اظہار نہ کرتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو یقیناً ان کی پرستش ہوتی۔ ایک مذہب زدہ قوم سے اپنی پرستش کرا لینا مشکل ہی کیا ہے۔ اس کے لئے بس ذرا سی منافقت اور تھوڑا سا بہروپئے کا فن درکار ہے۔ بنا بریں، یہ بھی باور نہیں کیا جا سکتا کہ صدرِ مملکت کی یہ باتیں کسی سیاسی مصلحت کی پیدا کردہ ہیں۔

لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ یہاں نہ صرف یہ کہ جدتِ فکر و نظر شجرِ ممنوعہ بنکر رہ گیا ہے بلکہ روایت پرستی اور قدامت پسندی کو جس قدر فروغ اسوقت حاصل ہے، اس سے پہلے شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو۔ جہالت کی تاریکیاں دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ توہم پرستی کے گھنیرے سائے، اور لمبے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ غلط عقل و فکر معتقدات کی گرہیں دن بدن مضبوط سے مضبوط تر کی جا رہی ہیں۔ مذہبی درسگاہیں، جن میں یہ تاریکیاں پلتی اور پروان چڑھتی ہیں، ان کی تعداد میں نت نئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور قیامت بالائے قیامت یہ کہ پہلے یہ کچھ، لوگوں کی انفرادی کوششوں سے ہوتا تھا، اب اسے خود حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ جو مزار سیلابِ زمانہ کے ہاتھوں مسمار ہوتے جا رہے تھے وہ خود حکومت کی توجہ اور اوقاف کے روپے سے از سرِ نو تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ قدامت پرستی کے مراکز جو رفتہ رفتہ گمنام ہو رہے تھے، حکومت کی زیرِ پرستی، پھر سے ابھر رہے ہیں۔ قانون سازی کے سلسلہ میں یہ اصول ایک مسلمہ کی حیثیت اختیار کر رہا ہے کہ وہی قانون اسلام کے مطابق قرار پائیگا جسے قدامت پرست طبقہ مطابق اسلام قرار دے۔ بالفاظ دیگر ملک بڑی تیزی سے تھیاکریسی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہر وہ خیال، تصور، نظریہ، جسے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے سندِ جواز حاصل نہ ہو، الحاد و بیدینی اور کفر و ارتداد قرار پا جاتا ہے، اور اس آواز کو دبانے کے لئے معاشرہ کا فولادی پنجہ آگے بڑھ آتا ہے۔ اس کے لئے نشر و اشاعت کا ہر ذریعہ ممنوع قرار پا جاتا ہے۔ پبلک پلیٹ فارم، پریس، ریڈیو وغیرہ کے تمام دروازے اس پر بند ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ، اپنے بند کمروں میں، اس آواز کی تائید کرتے ہیں انہیں بھی جرأت نہیں ہوتی کہ وہی الفاظ باہر آ کر دہرا سکیں۔ اس میں نہ عوام کی تمیز ہے نہ خواص کی۔ حتٰکہ کارپردازانِ حکومت تک بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ غرضیکہ یہاں فکر و نظر کی دنیا ایک قید خانہ بن کر رہ گئی ہے جس کے ہر دروازے پر قدامت پرستی کا پہرہ دار متعین ہے۔ اسکولوں اور کالجوں تک میں یہ کیفیت ہے کہ قدامت پرستی کی جہالت کے خلاف ذرا سی تنقید، موردِ عتاب بنا دیتی ہے۔

یہ ہے ملک کی فضا جس میں، تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد صدرِ محترم کی یہ آواز کانوں میں پڑتی ہے کہ جو قوم ندرتِ فکر و عمل اور جدتِ خیال و نظر سے عاری ہے وہ زندہ قوموں کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہ سکتی۔

سوال یہ ہے کہ جو کچھ کہا جاتا ہے اگر وہ حقیقت پر مبنی ہے ——— اور اس کے مبنی بر حقیقت ہونے میں شبہ ہی کیا ہے ——— تو

پھر اس قوم میں ندرتِ فکر و عمل اور جدتِ خیال و نظر پیدا کرنے، اور پیدا شدہ کو تقویت دینے کے لئے کیا اقدامات کئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی مقصد کے حصول کے لئے بنیادی شرائط (۱) حسنِ نیت اور (۲) ضروری اسباب و ذرائع ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے، اس باب میں صدرِ مملکت کی حسنِ نیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا، جہاں تک اسباب و ذرائع کا تعلق ہے، انہیں وہ اختیارات حاصل ہیں جن کی رُو سے ان اسباب و ذرائع کے مہیا ہو جانے میں کوئی دقت پیش نہیں آ سکتی۔ اس کے بعد ضرورت صرف پہلا قدم اٹھانے کی ہے۔ معلوم نہیں اس کے لئے اس قدر تامل اور توقف کیوں کیا جا رہا ہے۔ ہم صدرِ محترم کی خدمت میں باادب گذارش کریں گے کہ اس باب میں پہلے ہی بڑی تاخیر ہو چکی ہے۔ اب مزید تاخیر جس قدر نقصان کا باعث بن سکتی ہے وہ بالکل واضح ہے۔ اس سلسلہ میں ہم چند ایک عملی تجاویز پیش کرنے کی جرأت کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلے ایک ایسا پریس قائم کیا جائے جس میں ہر شخص پوری آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکے۔ "ہر شخص" سے مراد ارباب دانش و بینش ہیں۔ اور "پوری آزادی" سے مقصود ہے، قرآن کی عطا کردہ مستقل اقدار کے اندر رہتے ہوئے اظہارِ خیال۔ اس وقت ملک میں کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے اس طرح اظہارِ خیال کیا جا سکے۔

(۲) ریڈیو اظہارِ خیال کا بڑا موثر ذریعہ ہے، اسے بھی اس مقصد کے لئے کھلا رکھا جائے۔

(۳) نصابِ تعلیم اس طرح بدلا جائے کہ ہر طالب علم قرآنی مستقل اقدار اور نظامِ معاشرہ پر علیٰ وجہ البصیرت۔ دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ — یقین رکھے اور ان کا احترام اور ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کا ولولہ اُس کا اندرونی تقاضا بن جائے۔

(۴) اس قسم کے ارباب فکر و نظر کی ہر ممکن طریق سے حوصلہ افزائی کی جائے۔ معاشرہ میں ان کا احترام پیدا کیا جائے۔ ان میں جو صاحب قلم، اس قسم کا لٹریچر مرتب کرنا چاہیں انہیں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

(۵) جو ادارے حکومت کی زیرِ سرپرستی قائم ہیں انہیں کہا جائے کہ وہ نظری اور تجریدی مسائل کی تحقیق میں وقت اور روپیہ ضائع کرنے کے بجائے اپنی تمام کوششوں کو قرآن کریم کی روشنی میں عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق زندگی کے عملی معاملات کا حل دریافت کرنے پر مرکوز رکھیں۔

(۶) جن گوشوں سے قدامت پرستی کی جہالت عام کی جاتی ہے، ان سے (کم از کم) حکومت کی سرپرستی اٹھالی جائے۔

(۷) کفر و الحاد کی فتویٰ بازی کو قانوناً بند کر دیا جائے۔ اور خیالات کے اختلاف کی بنا پر لوگوں کو کسی کے خلاف مشتعل کرنے کو جرم قرار دیدیا جائے۔

ہم نہیں سمجھتے کہ ان تجاویز کو عمل میں لانے کے لئے کسی قسم کی ناقابلِ عبور دقت پیش آ سکتی ہے۔

سب سے اہم مسئلہ ملک کے لئے اسلامی قوانین مرتب کرنے کا ہے۔ اس سلسلہ میں صدرِ محترم نے

فرمایا ہے کہ

میرا پختہ ایمان ہے کہ مذہب کے بنیادی اصول مستقل اور غیر متبدل ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا اطلاق زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ہونا چاہیئے۔

اس "ایمان" کو اگر قانون سازی کا بنیادی اصول بنا دیا جائے تو سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ یہ مستقل اور غیر متبدل" اصول و احکام قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ اور ذرا سی کوشش سے یک جا کئے جا سکتے ہیں۔

ہم محترم صدر مملکت کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ فطرت نے انہیں کام کرنے کا ایک اور موقعہ عطا کیا ہے اور انہیں نہایت وسیع اختیارات سے نوازا ہے۔ اگر وہ اس موقعہ کو غنیمت جان کر اپنے ان خیالات اور ایمان کو عملی شکل دے دیں، تو اس سے نہ صرف اس درماندہ قوم کی قسمت بدل جائے گی بلکہ یہ عالمگیر انسانیت پر بھی احسان عظیم ہوگا۔ اور آپ کی اس خدمت جلیلہ کے صلہ میں آپ کا نام اس دنیا میں بھی ابد تک روشن رہے گا اور آخرت میں بھی آپ کو سرفرازی و سرخروئی نصیب ہوگی۔ بس اس کے لئے ایک جرأت مندانہ "ہو" کی ضرورت ہے۔ آپ یہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ملک کا ہوشمند طبقہ کس طرح پروانہ وار آپ کے گرد جمع ہو جاتا ہے۔ زمانے کے دھارے کا رخ کسی مرد حق آگاہ کے جرأت مندانہ اقدام ہی سے بدلا کرتا ہے۔ یہی ایک حقیقت ہے۔ باقی سب افسانہ ہے۔

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں ۔۔۔ جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

کیا تنہا عقلِ انسانی

زندگی کے اہم مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے! اس سوال کا جواب اسی صورت میں دیا جا سکتا ہے جب یہ معلوم ہو کہ عقلِ انسانی نے زندگی کے مسائل کا حل دریافت کرنے کے لئے کیا کوششیں کی ہیں۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ یونان کے فلاسفروں سے لیکر آجتک کے بڑے بڑے مفکرین نے انسانی مشکلات کے حل کیلئے جو کچھ لکھا ہے وہ آپکے سامنے ہو۔ مفکرِ قرآن کی مایۂ ناز تصنیف

انسان نے کیا سوچا

میں یہ سب کچھ آپ کے سامنے آجائیگا۔ کتاب بڑی تقطیع پر نہایت خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے۔ مجلد کی قیمت بارہ ۱۲ روپے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵ بی۔ گل برگ۔ لاہور

باب المراسلات

انسان کی افضلیت

لاہور سے ایک طالب علم نے ایک سوال پوچھا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہے وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (۱۷/۷۰)۔ ہم نے انسان کو اپنی مخلوق میں سے اکثر پر فضیلت دی ہے: اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ایسی مخلوق بھی ہے جس سے انسان افضل نہیں۔ لیکن زمین پر تو ایسی مخلوق کوئی معلوم نہیں ہوتی۔ کیا کسی اور جگہ بھی مخلوق ہے؟ ہو سکتا ہے کہ وہ مخلوق ارتقائی طور پر انسان سے آگے ہو۔ لیکن انسان کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ اسے اس نے اپنا خلیفہ (نائب) بنایا ہے۔ تو خدا کے خلیفہ سے زیادہ افضل کون ہو سکتا ہے؟

جواب

قرآن کریم اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ ارض کے علاوہ سماوات (اجرام فلکی) میں بھی ذی حیات مخلوق ہے۔ وَ مِنْ آيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ (۴۲/۲۹) اس کی تائید ([illegible]) سے بھی ہوتی ہے۔ یعنی زمین اور آسمانوں میں ذی حیات پھیلے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی اور کرّے میں ایسے ذی حیات ہوں جو ارتقائی سلسلہ میں انسان سے بھی آگے ہوں۔ وہ مخلوق انسان سے افضل ہوگی۔ ضمناً آیت (۴۲/۲۹) کا آخری حصہ یہ ہے وَ هُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ۔ خدا کے قانونِ مشیت کی رو سے یہ بھی ممکن ہے کہ زمین اور آسمانی کروں کی یہ مخلوق یکجا ہو جائے۔ اس وقت جو کوششیں دوسرے کرّوں تک پہنچنے کی ہو رہی ہیں ہو سکتا ہے کہ انہی سے یہاں اور وہاں کی مخلوق کے یکجا ہونے کا امکان عملی شکل اختیار کرے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مخلوق ہم سے آگے ہو۔

باقی رہا انسان کا خلیفۃ اللہ ہونا تو یہ تصور ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ خدا نے یہ کہیں نہیں کہا کہ ہم نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ اس نے صرف اتنا کہا ہے کہ آدم کو خلیفہ فی الارض بنایا گیا ہے۔ خلیفہ کے معنی کسی کا جانشین ہوتے ہیں۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ انسان سے پہلے دنیا میں کوئی مخلوق تھی جس میں گری پڑی ہوئی قوت کرنے کی صلاحیت زیادہ تھی۔ وہ مخلوق ناپید ہو گئی اور اس کا جانشین انسان کو بنایا۔ (۲/۳۰)

۲- کیا زمین متحرک ہے؟

ضلع پشاور سے ایک صاحب نے حسب ذیل استفسار بھیجا ہے۔

۱۔ موجودہ سائنس کہتی ہے کہ زمین گول ہے اور گھومتی ہے اور یہ کہ سورج ساکن ہے۔ لیکن قرآن پاک میں لکھا ہے کہ سورج اپنی منزلیں طے کرتا ہوا ایک جھیل میں غیب ہو جاتا ہے، غالباً جہاں ذوالقرنین کا قصہ ہے وہاں ہی یہ سب کچھ لکھا ہے۔ دوسرا یہ کہ سائنس دان کہتے ہیں کہ چاند سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ کبھی چاند چھوٹا ہو جاتا ہے اور کبھی بڑا ہو جاتا ہے۔

مہربانی فرما کر اس سارے معاملہ پہ ایک مفصل مضمون لکھیں اور بہتر ہوگا کہ آپ اس کو طلوع اسلام میں چھاپ دیں۔ اس پہ لوگوں میں بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ اس کے متعلق ہمارے سکولوں میں جو تعلیم دی جا رہی ہے قرآنی حقائق کے خلاف ہے لہٰذا اس سے متعلق نصاب کو بدلنا چاہیئے۔

طلوع اسلام

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن کریم سائنس کی کتاب نہیں کہ اس میں اس قسم کے امور کی تفصیل دی گئی ہو۔ لیکن چونکہ اس خدا کی کتاب ہے جو خالق کائنات ہے اس لئے اس میں اگر کسی جگہ ضمناً ایسے امور کا ذکر آگیا ہے تو ہو نہیں سکتا کہ وہ حقیقت کے خلاف ہو۔

قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ سورج اپنی منزلیں طے کرتا ہوا ایک جھیل میں غائب ہو جاتا ہے۔ اس نے ذوالقرنین کا قصہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب اس نے مغرب کی طرف رخ کیا تو ساحل سمندر (بحیرہ اسود) تک جا پہنچا۔ وہاں تا حدِ نگاہ پانی ہی پانی تھا۔ اس لئے اسے ایسا دکھائی دیا کہ سورج سمندر میں غروب ہو رہا ہے۔ سمندر کے کنارے ایسا ہی نظر آیا کرتا ہے۔ (۱۸/۸۶)

زمین کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ اَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ (۱۶/۱۵)۔ مادَ کے معنی زور سے گھومنا اور حرکت کرنا ہیں۔ مَادَتْ بِہِ الْاَرْضُ کے معنی ہیں زمین اسے لے کر گھومی۔ اس سے زمین کے متحرک ہونے کا اشارہ ملتا ہے۔

باقی رہا چاند اور سورج کا معاملہ۔ سو ان کے متعلق سورۃ یٰسین میں ہے۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ

تَجْرِیْ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (۳۶/۳۸)۔ سورج اپنے مقررہ راستہ پر چلتا ہوا اپنے مستقر کی طرف جاتا ہے۔ یہ اس خدا کے مقرر کئے ہوئے پیمانے (قوانینِ فطرت) ہیں جو بڑے غلبہ اور علم کا مالک ہے۔ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ (۳۶/۳۹)۔ چاند کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کر رکھی ہیں۔ حتکہ تمام اجسام فلکی کے متعلق ہے۔ کُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (۳۶/۴۰)۔ یہ سب اپنے اپنے مدار (ORBIT) میں تیزی سے تیر رہے ہیں۔ شمس اور قمر دونوں کے متعلق دَآئِبَیْنِ کہا (۱۴/۳۳)۔ یعنی مسلسل حرکت میں رہنے والے۔

جہانتک روشنی کا تعلق ہے قرآن کریم میں ہے وَجَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا (۱۰/۵)۔ ضیاء اور نور دونوں کے معنی روشنی کے ہیں۔ لیکن ائمہ لغت نے ان میں فرق یہ بتایا ہے کہ ضیاء اس روشنی کو کہتے ہیں جو کسی کی ذاتی ہو اور نور اسے جو اس نے کسی سے مستعار لی ہو۔ قرآن نے سورج کی روشنی کو ضیاء سے تعبیر کیا ہے (یعنی اس کی ذاتی روشنی) اور چاند کی روشنی کو نور سے (یعنی دوسرے سے لی ہوئی روشنی) سورہ الشمس میں ہے۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا۔ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (۹۱/۱-۲)۔ اس کے معنی ہیں چاند جو روشنی حاصل کرنے کے لئے سورج کے پیچھے جاتا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ چاند کی روشنی اپنی نہیں۔ وہ اسے سورج سے حاصل کرتا ہے۔

ان اشارات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ سائنس کے انکشافات نے جو کچھ اس وقت تک بتایا ہے وہ قرآن میں بیان کردہ حقائق کے مطابق ہے۔ لہٰذا اس جہت سے اس نصاب میں تبدیلی کی ضرورت نہیں جو قرآن پر مشتمل ہو۔ لیکن زمین و آسمان کے متعلق جو تعلیم مُلا کے ہاں سے ملتی ہے، اس کی روشنی میں چاند سورج ہی نہیں بلکہ سائنس کے تمام انکشافات کو دریا برد کر دینا پڑتا ہے۔ وہ ابھی تک زمین کو ساکن بتاتا ہے اور سورج کے متعلق کہتا ہے کہ وہ شام کو خدا کے عرش کے نیچے جا کر چھپ جاتا ہے جہاں سے اسے فرشتے دوسرے دن نکالتے ہیں۔ وہ سردی اور گرمی کے موسموں کے متعلق یہ تحقیق انیق پیش کرتا ہے کہ جب خدا نے جہنم کو پیدا کیا تو اس کا منہ باندھ دیا۔ جہنم نے شکایت کی کہ اس سے تو اس کا دم گھٹتا ہے۔ چنانچہ اسے اجازت دی گئی کہ وہ سال میں ایک مرتبہ سانس اندر کھینچے اور ایک مرتبہ باہر نکالے۔ جب جہنم سانس اندر کھینچتی ہے تو سردی کا موسم آجاتا ہے اور جب وہ اسے باہر نکالتی ہے تو گرمی کا موسم آجاتا ہے۔ اور قیامت یہ ہے کہ وہ ان باتوں کو اس ذاتِ اقدس و اعظم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی احادیث بتاتا ہے جو علم انسانی کے افقِ بلند پر فائز تھی۔ یا للعجب! اور جس شخص کی غیرت اس کی اجازت نہ دے کہ وہ اس قسم کی باتوں کو حضورؐ کی طرف منسوب کرے، اسے منکرِ حدیث قرار دے کر دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ سچ کہا تھا اقبالؔ نے کہ

مکتبِ مُلا و اسرارِ کتاب　　　کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

مُلّا کے اختلافات

لاہور سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے چاہا کہ معلوم کروں کہ شریعت کی رُو سے امسال ہمیں فطرانہ کے پیسے کتنے دینے چاہئیں۔ اتفاق سے میں نے اخبار میں ایک خبر دیکھی جس کا عنوان تھا "فطرے کی رقم"۔ خوش ہوا کہ سوال کا جواب گھر بیٹھے مل گیا۔ لیکن اس کے نیچے جو کچھ لکھا تھا وہ یہ تھا۔

"فطرے کی رقم"

> فطرہ نماز عید الفطر سے پہلے ادا کرنا چاہیئے۔ فطرے کی رقم اہل سنت والجماعت کے عقیدے کے مطابق سوا دو سیر گندم کی قیمت کے برابر ہونی چاہیئے جس کا اندازہ ایک روپیہ ۵ پیسہ لگایا گیا ہے۔ اہل حدیث حضرات کے عقیدے کے مطابق پونے تین سیر گندم کی قیمت کے برابر فطرہ ادا کرنا چاہیئے۔ رقم کے متعلق اہل حدیث علمائے یہ مشورہ دیا ہے کہ جس قیمت پر گندم آپ خرید کرتے ہوں اسی حساب سے پونے تین سیر گندم کی قیمت ادا کریں ناظم جمعیت اہل حدیث مولانا ابوبکر غزنوی نے مشورہ دیا ہے کہ احتیاطاً ڈیڑھ روپیہ فی کس ادا کیا جائے۔ شیعہ علماء نے فطرے کی رقم دو روپے مقرر کی ہے۔

یعنی اہل سنت کا حکم یہ ہے کہ فطرے کی رقم سوا روپیہ ہے۔ دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں! یہ رقم (اہل حدیث کی شریعت کے مطابق) ڈیڑھ روپیہ ہے۔ اور شیعہ حضرات کے فیصلے کے مطابق دو روپے فی کس ــــ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ ہمارے مذہبی پیشوا حضرات ایسی چھوٹی سی بات پر بھی متفق فیصلہ نہیں دے سکتے۔ کیا یہ کسی بات پر متفق ہوتے بھی ہیں؟

طلوع اسلام

آپ تو ایک فطرے کی رقم پر اختلاف کو دیکھ کر ہی سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ آپ نگاہ کو ذرا دور لے جاتے تو دیکھتے کہ وہاں کیا کیا نظر آتا ہے؛ روزہ کس وقت کھولنا چاہیئے۔ اس میں اختلاف۔ تراویح کی رکعت کتنی ہیں۔ اس میں اختلاف۔ عید کی نماز کا وقت کونسا ہے۔ اس میں اختلاف۔ نماز عید مساجد میں پڑھنی چاہیئے یا کھلے میدان میں۔ اس میں اختلاف۔ نماز عید کی زائد تکبیریں کتنی ہوتی ہیں۔ اس میں اختلاف۔ ہاتھ باندھنے میں اختلاف۔ آمین کہنے میں اختلاف۔ غرضیکہ قدم قدم پر اختلاف۔ کوئی جزئی سا جزئی معاملہ بھی ایسا نہیں جس میں یہ حضرات متفق ہوں ــــ ہاں! ایک بات ضرور ایسی ہے جس میں یہ متفق ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ہے اُس شخص کے خلاف کفر کا فتویٰ لگانا جو ان اختلافات کو مٹانے کے لئے انہیں قرآن کی طرف دعوت دے۔ اور یہ اس لئے کہ اگر یہ اختلافات مٹ جائیں تو ان کی مختلف دکانیں کس طرح سے

چلیں ؟ آپ ذرا اس کھلی ہوئی حقیقت پر غور کریں، بات واضح ہو جائیگی۔ ایک محلہ میں ایک مسجد موجود ہے اور وہ اتنی وسیع ہے کہ اس میں محلے کے سب نمازی سما سکتے ہیں۔ اتنے میں ایک اور مولوی صاحب "فارغ التحصیل" ہو کر آجاتے ہیں۔ اس مسجد میں پہلے سے امام صاحب موجود ہیں۔ اب یہ نووارد بیچارہ کیا کرے ؟ اس کی روٹی کا اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں کہ ایک اور مسجد بنے۔ لیکن یہ مسجد کیسے بنے ؟ اس کے لئے نہایت آسان طریقہ ہے۔ وہ یہ وعظ کہنا شروع کر دیتا ہے کہ اس مسجد کا امام ہاتھ زیر ناف باندھتا ہے۔ لیکن شریعت حقہ کا فیصلہ یہ ہے کہ ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں۔ لہٰذا اس امام کے پیچھے نماز ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ بار بار اس آواز کو دھراتا ہے اور اس کے بعد ایک کھلی جگہ پر دس اینٹیں اور پانچ لوٹے رکھ کر اذان دے دیتا ہے۔ سینے پر ہاتھ رکھنے کو شریعت حقہ ماننے والے اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور یوں اس کے لئے امامت کی آسامی نکل آتی ہے۔ اس کے بعد وہ اٹھتے بیٹھتے اس "محکم عقیدہ" کی تبلیغ کرتا رہتا ہے کہ جو لوگ زیر ناف ہاتھ رکھنے والے امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں ان کی نماز نہیں ہوتی۔ آپ سوچیے کہ اگر یہ اختلاف پیدا نہ کیا جاتا تو اس کے لئے نیا ٹھکانا کیسے بن سکتا تھا ؟ یہ وجہ ہے کہ یہ لوگ اس قسم کے اختلافات کو اس شدت سے قائم رکھتے ہیں اور ہر اس آواز کو جو اختلافات مٹانے کے لئے اٹھے "کفر و الحاد کی آواز قرار دے کر" اسے دبانے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا رسول اللہ کے زمانے میں بھی یہ اختلافات موجود تھے ؟

تجہیز و تکفین کے اخراجات

<u>سوال</u> : آج کل چیزوں کی گرانی ہوشربا حد تک پہنچ چکی ہے۔ بیشتر آبادی ایسی ہے جسے دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ اور غریب آدمی کے پاس علاج کے لئے پیسہ تک نہیں ہوتا۔ وہ پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے لاعلاج مرجاتا ہے۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد اس کے کفن دفن اور بعد کی رسومات کے لئے اس قدر خرچ کی ضرورت ہوتی ہے کہ مرنے والے کے پس ماندگان اس بوجھ کے تلے دب کر مر جاتے ہیں۔ کفن کے لئے اٹھارہ گز لٹھے کی قیمت کا ہی اندازہ لگائیے۔ مرنے والے کو برسوں سے نیا کرتہ نصیب نہیں تھا۔ لیکن مرنے کے بعد اٹھارہ گز کپڑا اسے دفن کرنے کے لئے درکار ہوتا ہے۔ پھر قل، جمعراتیں، چالیسواں، اور سال پر ختم۔ غریب لوگ کیا، متوسط طبقے کے لوگ بھی ان اخراجات کی استطاعت نہیں رکھتے۔ لیکن بایں ہمہ انہیں یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کیا یہ سب کچھ واقعی ضروری ہے ؟ کیا اس خرچ میں تخفیف نہیں ہو سکتی ؟ لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ از روئے شریعت ضروری ہے۔ اور وہ اس ڈر سے یہ تمام اخراجات برداشت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں خواہ اس کے لئے انہیں گھر کے برتن بھی کیوں نہ بیچنے پڑیں ؟

<u>جواب</u> : ضروری صرف اس قدر ہے کہ مردے کو سپرد خاک کیا جائے اور اس کے لئے نیک آرزوؤں کا اظہار کیا جائے۔

اور انسانی جذبات کا تقاضا ہے کہ یہ کچھ احترام اور سنجیدگی کے ساتھ کیا جائے۔

جہاں تک کفن کے لئے اٹھارہ گز نئے لٹھے کی ضرورت کا سوال ہے۔ ہمارے اس بھائی کی نگاہ صرف غریبوں کی ناداری تک پہنچی ہے۔ لیکن ذرا گہرائی تک جانے سے نظر آئے گا کہ اس سوال کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ ایک شہر لاہور میں ایک دن میں کتنی میتیں ہوتی ہیں۔ پھر اس تعداد کو پورے پاکستان پر پھیلا دیجئے۔ اور پھر تمام ممالک اسلامیہ میں مرنے والوں کی تعداد سامنے لائیے۔ اور اسے اٹھارہ سے ضرب دیجئے۔ آپ کی قوم —— نہایت غریب اور پس ماندہ قوم —— اتنے گز نیا کپڑا ہر روز زمین کے نیچے دبا رہی ہے —— ہر روز۔ سال کے تین سو پینسٹھ دن۔ لاکھوں گز نیا کپڑا۔ جسے تیار کرنے کے لئے کتنے ہی کارخانے درکار ہیں —— زمین کے نیچے چلا جاتا ہے۔ آپ نے کبھی اس کا بھی اندازہ لگایا ہے؛ اگر یہی کپڑا زندہ انسانوں کو میسر آ جائے تو کتنوں کا تن ڈھنپ جائے؟

اس باب میں صحیح مسلک کیا ہونا چاہیئے؛ اس کے متعلق حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ارشاد گرامی سنئے۔ روایت میں ہے کہ آپ نے اپنی تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں وصیت فرمائی کہ

> انہیں ان دو کپڑوں میں کفن دیا جائے جو وہ بالعموم پہنا کرتے تھے۔
> حضرت عائشہؓ نے کہا کہ ابا جان! ہم میں اتنی استطاعت ہے کہ
> ہم نئے کپڑوں میں آپ کو کفن دے سکیں۔ انہوں نے فرمایا کہ
> اے میری بیٹی! زندہ شخص نئے کپڑے کا زیادہ حقدار ہے۔
> کفن تو اس لئے ہوتا ہے کہ پیپ وغیرہ اس میں جذب ہو جائے۔
> (طبقات ابن سعد۔ بحوالہ۔ ابوبکرؓ۔ از محمد حسین ہیکل)

چنانچہ طبقات میں ہے کہ آپ کی انہی دو چادروں کو دھو کر اور ان کے ساتھ ایک اور چادر ملا کر آپ کو دفنایا گیا۔

باقی رہا قل۔ جمعراتیں۔ چالیسواں اور ان کے ختم، تو یہ سب رسومات غیر قرآنی ہیں۔ جو کچھ ان پر صرف کیا جاتا ہے اس میں سے حبہ بھر بھی مردے تک نہیں پہنچتا۔ وہ سب ختم پڑھنے والے مولوی صاحبان کے ہاں چلا جاتا ہے۔

نظام ربوبیت کب قائم ہوگا؟

شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جو میری ڈاک میں اس قسم کے استفسارات موصول نہ ہوتے ہوں۔ با جو احباب بالمشافہ

گفتگو کریں وہ یہ سوال نہ پوچھتے ہوں کہ نظامِ ربوبیت جس کا تصور میں ایک عرصہ سے پیش کر رہا ہوں وہ بالآخر کب قائم ہوگا ؟ مجھے ان احباب کی بیتابیِ تمنا کا پورا پورا احساس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ معاشرہ کے حالات جس قدر خراب ہو چکے ہیں (اور مزید خراب ہوتے جا رہے ہیں) ان سے اس طبقہ پر کیا گذر رہی ہے جو پوری پوری محنت و مشقت اور سعی و کاوش کے باوجود اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریاتِ زندگی پوری نہیں کر سکتے۔ ان کے حالات سنتا ہوں تو دل خون ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان کی ان مصیبتوں کا علاج ۔۔۔ اتنا ہی نہیں بلکہ معاشرہ کی بے شمار خرابیوں کا علاج ۔۔۔ قرآنی نظامِ ربوبیت کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ نظام انفرادی طور پر قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ ملک کے وسائلِ پیداوار تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لئے ملت کی اجتماعی تحویل میں ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ انتظام حکومت کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے میں پہلے دن سے نہایت صراحت اور وضاحت سے پیش کئے چلا آ رہا ہوں۔ اور اس کے لئے میرا اوّلیں مخاطب برسرِ اقتدار طبقہ ہوتا ہے کہ اگر بات ان کی سمجھ میں آ جائے اور وہ اس قرآنی مشن کو پورا کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو اس نظام کے قائم ہونے میں نہ دیر لگ سکتی ہے۔ نہ دقت پیش آ سکتی ہے۔ ہمارا دور آئینی ہے اور مملکت کے نظام میں ہر تبدیلی آئینی طور پر ہی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے دوسری صورت یہ ہے کہ اس تصور کو ملک میں اس قدر عام کیا جائے کہ یہ جمہور کا تقاضا بن جائے اور وہ ایسے افراد کو اپنا نمائندہ منتخب کر کے مجالسِ قوانین ساز میں بھیجیں جو اس نظامِ خداوندی کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہوں اور اسے عملاً متشکل کرنے کا عزم لیکر ان مجالس میں جائیں۔ میں جو اس فکر کو اپنی بساط کے مطابق عام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو اس سے یہی مقصد ہے۔

۲۔ بعض احباب یہ تجویز لے کر آتے ہیں کہ جو لوگ اس تصور سے متفق ہیں وہ ایک محدود شکل میں اپنے طور پر اس نظام کو قائم کیوں نہیں کر لیتے۔ ان کی تجویز کا ملخص یہ ہوتا ہے کہ یہ احباب ایک چھوٹی سی بستی بسالیں جس میں اس تصور کو عملی شکل دیکر اپنی زندگی اس نہج پر بسر کریں۔

یہ تجویز نئی نہیں۔ یہ برسوں سے میرے سامنے لائی جا رہی ہے اور متعدد بار اس پر غور و خوض ہو چکا ہے۔ اور اسے ناقابلِ عمل پا لیا گیا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جب آپ اس قسم کے انفرادی نظام کی آواز بلند کریں گے، اس پر لبیک کہنے والوں میں (زیادہ نہیں تو کم از کم) نوے فیصد (HAVE- NOTS) یعنی وہ لوگ ہونگے جن کی آمدنی ان کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کفایت نہیں کرتی۔ اور (شاید) دس فیصد لوگ ایسے ہوں جو اپنی ضروریات پوری کر سکیں یا جن کے پاس ضروریات سے کچھ زائد ہو۔ میں احباب کو مایوس نہیں کرنا چاہتا لیکن میرا خیال ہے کہ میرا یہ اندازہ بھی کچھ خوش فہمی ہی پر مبنی ہے جن کے پاس ضروریات سے زائد دولت ہو، وہ بہت کم ادھر آئیں گے۔ اب آپ سوچئے کہ جو نظام اس قسم کے احباب پر مشتمل ہوگا وہ چل کیسے سکے گا ؟

اس کے بعد ایک بڑی دشواری اور سامنے آتی ہے۔ اس قسم کا نظام قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ زائد از ضرورت

دولت رکھنے والے حضرات) کے افراد خاندان ــــ ان کے بیوی بچے اور دیگر متعلقین ــ سب اس فکر سے متفق اور اس رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ ان کے دلی تعاون کے بغیر یہ نظام ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک الگ جماعت قائم کرنا ــــ چہ جائیکہ ایک الگ بستی بسانا ـ تو میری دعوت کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر اس تجویز کو نہ اس سے پہلے کبھی قابل عمل سمجھا گیا۔ اور نہ ہی اب درخور اعتنا سمجھا جاتا ہے۔ نامساعدت حالات کے ہاتھوں پس جانے والے احباب کی بیتابی تمنا بجا اور درست۔ لیکن اس کا علاج پورے معاشرہ کے نظام میں تبدیلی کے سوا کچھ نہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے۔ ان مصیبت زدہ احباب کی داستان غم و الم سنکر جو کچھ میرے قلب حساس پر بیتتی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اس سے میرے سینے میں بھی جذبات کے کچھ کم تلاطم انگیز طوفان نہیں اٹھتے۔ لیکن میں شدت جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتا (نہ ہی کسی کو ایسا قدم اٹھانے کا مشورہ دے سکتا ہوں) جس کا نتیجہ مایوسی اور افسردگی کے سوا کچھ نہ ہو

لیکن میں اتنا اور عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میری دعوت صرف نظام ربوبیت کا قیام نہیں۔ یہ تو اس دعوت کا ایک گوشہ ہے۔ میری دعوت کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ اسلام' جو خدا کے عطا کردہ دین کے بجائے انسانی ذہنوں کا تراشیدہ مذہب بنکر رہ گیا ہے' اسے پھر سے اس کی اصلی اور حقیقی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے' اور اس طرح قرآن کی شمع آسمانی کو جس پر انسانوں کے خود ساختہ تصورات، نظریات، معتقدات اور رسوم و رواج کے دبیز پردے پڑ چکے ہیں' پھر سے وجہ تابانی محفل انسانیت بنایا جائے۔ اگر دین اپنی حقیقی شکل میں مسلمانوں کے سامنے آجائے تو پھر نظام ربوبیت کا قیام اس کا فطری نتیجہ ہوگا۔ اس وقت اس کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے خود ساختہ "مذہب" کا وجود ہے۔ یہ ہے میری بنیادی دعوت اور یہ ہے میری تمام کوششوں کا منتہیٰ و مقصود۔ اس سے نہ صرف ہمارے نظام معیشت میں تبدیلی آئیگی بلکہ زندگی کا ہر گوشہ خوشگوار آسمانی انقلاب سے ہم آغوش ہوگا۔ جس سے پھر وہ انسانیت ساز فضا وجود پذیر و متدی دل و دماغ ہوگی جو ایک بار سرزمین حجاز میں محمد رسول اللہ والذین معہٗ (رض) کے مقدس ہاتھوں آئینہ پاش ہوئی تھی اور جسے دوبارہ دیکھنے کیلئے انسانیت کی آنکھیں ترس رہی ہیں۔ الحمد للہ کہ اس باب میں مجھے جو کامیابی ہوئی ہے وہ میری توقعات سے کہیں بڑھ کر ہے۔ میں جب اس فضا پر نگاہ ڈالتا ہوں جس میں یہ آواز آج سے تقریباً تیس برس پہلے بلند کی گئی تھی پھر اپنی بے سروسامانی پر نظر ڈالتا ہوں۔ اور اس کے بعد یہ دیکھتا ہوں کہ آج کس طرح ملک کے گوشے گوشے تک یہ آواز پہنچ چکی ہے اور اس نے کس طرح فضا میں ایک خوشگوار ارتعاش اور امید افزا تحریک پیدا کر دیا ہے' تو میرا سر نیاز بارگاہ ایزدی میں مستانہ وار جھک جاتا ہے۔

یہ ہے درحقیقت میری بنیادی دعوت۔ اسی کے لئے میں جیتا ہوں اور آرزو یہ ہے کہ جب میں اس دنیا سے رخصت ہوں تو یہی پکار میرے لب پر ہو۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ ۔

یہ ہے جواب ان استفسارات کا جو اس سلسلہ میں مجھے اکثر موصول ہوتے رہتے ہیں اور جن کا فرداً فرداً جواب دینا میرے لئے مشکل ہے۔ (پرویز)

۲- رسول اللہؐ کی رسالت کا ثبوت

(سابق) سندھ کے ایک شہر سے، قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب کا تفصیلی خط آیا ہے۔ چونکہ خط میں جو سوال اٹھایا گیا ہے اس کا تعلق کسی ایک فرد (یعنی مستفسر) ہی سے نہیں بلکہ وہ سوال اکثر دلوں میں، بالخصوص ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں، پیدا ہوتا رہتا ہے، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس خط اور اس کے جواب کو طلوعِ اسلام میں شائع کیا جائے۔ خط حسبِ ذیل ہے۔

"بچپنا تھا۔ کچھ اچھی طرح یاد نہیں۔ شاید اکتالیس بیالیس کا زمانہ تھا۔ اُس وقت طلوعِ اسلام والد محترم کے ہاتھوں میں دیکھا تھا۔ بچوں سے طلوعِ اسلام کا نام پڑھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ اور والدہ کے سامنے شوخی بگھارنی شروع کی کہ میں اب رسالہ بھی پڑھ لیتا ہوں۔ پھر کچھ مدت بعد خبر نہیں طلوعِ اسلام نکلنا بند ہو گیا یا والد صاحب نے لانا چھوڑ دیا۔ خدا جانے کیا ہوا کبھی نہ دیکھا یا دیکھا تو کچھ خیال نہ کیا۔ وقت سالوں کی شکل میں بیت گیا۔ غالباً اکیاون، باون آیا۔ تو ہمارے ہاں طلوعِ اسلام بھی آنا شروع ہو گیا۔ اب کے میں نے طلوعِ اسلام کے پرچے تہہ نہیں کئے۔ پڑھا، شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔ کئی ایک کیا بہت سی باتیں سمجھ سے بالاتر تھیں مگر اکتاہٹ کے بجائے دلچسپی بڑھتی رہی۔ ایک دفعہ ایک مہمان نے ڈرائنگ روم کی میز پر طلوعِ اسلام پڑا دیکھا۔ تو حیران ہو کر والد صاحب سے پوچھنے لگا۔ کیوں صاحب یہ طلوعِ اسلام آپ پڑھتے ہیں؟ والد صاحب کے اثبات پر مہمان کے چہرے پر کچھ اچھے جذبات نہ دیکھ کر طلوعِ اسلام میں میری دلچسپی اور بڑھ گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ اُس زمانے میں میں نے والد صاحب سے پوچھا تھا۔ کہ پرویز صاحب نے اتنا علم کیسے اور کہاں سے حاصل کر لیا ہے؟ والد محترم ہر ماہ طلوعِ اسلام لاتے رہے اور میں ہر ماہ طلوعِ اسلام پڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۷۴ء اور جنوری ۱۹۷۵ء کا اکٹھا شمارہ بھی پڑھ کر طلوعِ اسلام کے پرانے پرچوں کے ساتھ محفوظ کر دیا ہے۔

کیمیائے سعادت۔ شاہ ولی اللہ کا نظریۂ توحید۔ بہشتی زیور اور قصص الانبیاء سے لے کر مولانا آزاد کی تصنیفات اور پہلے پانچ سات پاروں کی تفسیر کے علاوہ مولانا مودودی کی پچیس تیس کتابوں کو بھی پڑھا۔ ادیب فاضل کے کورس میں سیرت النبی اور کئی ایک مذہبی قسم کی کتابوں سے پالا پڑا۔ دو چار باہر کے مصنفین کی کتابیں بھی نظر سے گزریں۔ (Bible Correspondence School) سے "بائیبل مقدس" کا "کورس" کر کے سرٹیفکیٹ کو تو سرٹیفکیٹ بھی لیا ہے۔ گرو نانک کے خیالات پر مبنی سکھ منی اور جپ جی کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ شریمد بھگوت گیتا کا ترجمہ بھی پڑھا اور تلسی داس کی رامائن پڑھی۔ موجِ کوثر۔ آبِ کوثر، یعنی ان سب کوثروں کو بھی دیکھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے خیالات پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ "مولوی" کے پندرہ بیس، اور اس سے دو گنے "استاذ" کے پرانے رسالوں کا استعمال مل گیا۔ چھوڑا اُسے بھی نہیں۔ ستیارتھ پرکاش پڑھ چکا ہوں۔ برق کی تصانیف کو بھی دیکھا۔ ان کے علاوہ کئی ایک کتابیں اُدھ

مضامین اور ہیں۔ جن کی لسٹ بتانا گویا "میں" کو اجاگر کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ جو کچھ پڑھا بڑی جستجو سے پڑھا۔ جتنا پڑھا تشنگی اتنی ہی شدت اختیار کرتی گئی۔ ان مندرجہ بالا کتابوں کے پڑھنے سے ہوا یہ کہ میں ایک روز یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ کہ مذہب میں آخر رکھا ہی کیا ہے۔ اس میں کتنے جھگڑے ہیں۔ اس میں کتنے جھنجھٹ ہیں۔ موجودہ زمانے میں مذہب سے روپے کی طاقت زیادہ ہے۔ اور مذہب کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر یہ جھگڑا کرانے والی اور دلوں میں وہم ڈالنے والی شے نہ ہو تو کون سی قیامت آجائے گی۔ پھر میں اس خیال سے متفق ہو گیا۔ اور شدت سے ہوا۔ سوچتا دنیا میں مذہب کی چنداں ضرورت نہیں۔ اور اگر کبھی ضرورت تھی بھی تو پہلے وقتوں میں جب کہ تعلیم عام نہ تھی۔ مذہب اخلاق سکھانے کے لئے میدان عمل میں آیا۔ آج کے دور میں اگر مذہب نہ بھی ہو تو بھی لوگ تعلیم سے اخلاق سیکھ سکتے ہیں۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ وقت خود بخود سکھا دیتا ہے۔ اور پھر وہ لوگ جو مذہب تو کجا خدا ہی کو نہیں مانتے۔ وہ بھی تو زندگی گزار لیتے ہیں۔ اور ہم سے بہت بہتر گزارتے ہیں۔ آگے جا کر انہیں عذاب ملے گا۔ تو یہ بھی صحیح طور پر کیا معلوم۔ مذکورہ کتابوں نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد ڈاروِن کی تھیوری نے رہا سہا بھی خاک کی نذر کر دیا۔ اور گویا مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ کہ ڈاروِن نے غلط نہیں کہا۔ میں "ڈاروِن کا سالک" آخری مقام بھی طے کرنے کو تھا۔ اب میں آزاد ہونے کو تھا۔ یہ میری انتہا تھی۔ لیکن میں نے مطالعہ نہیں چھوڑا۔ جو بھی مذہبی کتاب ملتی، پڑھتا۔ اور پڑھنے کے بعد انہیں کسی کونے میں پھینک دیتا۔ طلوع اسلام اور اس ادارہ کی دوسری کتابیں بھی پڑھتا۔ مگر انہیں پڑھ کر کبھی ہنسی نہیں آئی۔ بلکہ دیر تک خاموش کسی سوچ میں ڈوبا رہتا۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ سوچ کیا ہوتی تھی۔ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ معراج انسانیت۔ انسان نے کیا سوچا۔ قرآنی فیصلے۔ سلیم کے نام خطوط۔ طاہرہ کے نام خطوط۔ ابلیس و آدم۔ مزاج شناس رسول۔ ان کے علاوہ کئی اور کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان مذکورہ کتابوں اور طلوع اسلام کے مسلسل مطالعہ سے ممکن ہے بہت سے فائدے ہوئے ہوں۔ مگر جس فائدے کا مجھے علم ہے وہ یہ ہوا۔ کہ میں کسی بات کو عقل و شعور سے کام لے کر ماننے کا عادی ہو گیا۔ اور اس عادت نے مجھے یہ ماننے پر مجبور کر دیا کہ ڈاروِن غلط کہتا ہے۔ مسلمان ہی کیا بلکہ دنیا کی تقریباً تمام قومیں خدا کے وجود کی کسی نہ کسی طرح قائل ہیں۔ لیکن قائل ہونا اور بات ہے۔ اور کسی بات پہ مطمئن ہونا اور بات ہے۔ اب میں قائل ہونے کے علاوہ مطمئن بھی ہوں۔ مجھے اطمینان ہے۔ مجھے یقین ہے۔ مجھے تسکین ہے۔ مجھے تسلی ہے۔ وہ خدا جو وہموں کے پردے میں تھا۔ آپ کی کتابوں کے مطالعہ سے اب ظاہر ہو چکا ہے۔ اب میں اُس خدا کو دل میں محسوس کرتا ہوں۔

لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے نہایت افسوس ہے۔ شدید قلق ہے۔ بڑا دکھ ہے۔ کہ وہ اطمینان جو مجھے خدا کے تصور سے ہے۔ رسول کریمؐ کے متعلق ویسا اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ کہ قائل ہونا اور بات ہے اور مطمئن ہونا اور بات ہے۔ اب اس درد کا مداوا چاہتا ہوں۔ تاکہ دل میں وہم و وسوسے، شک و شبہ کی

گنجائش ہی نہ رہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو بن جاؤں۔ اور شاید پھر عمل کرنا بھی شروع کر دوں۔ ہاں تو آپ رسول کریمؐ کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ

(۱) وہ سچے تھے۔ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ امین تھے وغیرہ وغیرہ۔ سب درست مگر یہ سب اچھائیاں تو نبوت ملنے سے پہلے بھی تھیں۔

(۲) چونکہ قرآن میں ان کی رسالت کا ذکر ہے اس لئے وہ رسول تھے۔

بالکل ٹھیک ہے اس کے لئے ہمیں قرآن کو خدائی کلام ثابت کرنا پڑے گا۔ یعنی اگر یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن خدائی کلام ہے۔ تو پھر آپ کی رسالت خود بخود پایۂ ثبوت تک پہنچ جائے گی۔ اور قرآن کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ

(I) چونکہ قرآن کے چیلنج کے باوجود اس جیسی کوئی دوسری کتاب نہیں بنی۔ اس لئے یہ خدائی کلام ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ قرآن کے چیلنج کو منظور کر کے دوسری کتاب اس کے مقابلہ میں بنائی گئی ہو۔ اور مسلمانوں نے اپنے عروج میں یا اس سے پہلے ہی کسی طریق سے ضائع کر دیا ہو یا کسی کو دے دلا کر ضائع کرا دیا ہو۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایسی کتاب بنائی جاتی تو کفار اس ذوق و شوق سے دعوتِ اسلام پہ لبیک نہ کہتے۔ عرض ہے کہ سرداروں کے ظلم و ستم سے نجات کے لئے بھی تو کفار اسلام قبول کر سکتے تھے۔

(II) چونکہ قرآن شریف میں کوئی بات جھوٹی نہیں۔ اس لئے یہ خدائی کلام ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں۔ کہ ایک کتاب ایسی لکھی جائے۔ جس میں کوئی جھوٹ نہ ہو۔ تمام نصائح ہوں۔

(III) چونکہ عام آدمی ایسی فلسفیانہ باتیں نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہ خدائی کلام ہے۔

باتوں کا عمر۔ تجربے اور کوشش دھیان وغیرہ پر بھی دارومدار ہوتا ہے۔ اور پھر چالیس سال کی عمر تک تو خاصا تجربہ حاصل ہو جاتا ہے۔

(IV) چونکہ پرانے زمانے کی (گذشتہ قوموں کی) باتیں بھی اس میں موجود ہیں۔ جبکہ رسول کریمؐ پڑھے لکھے ہی نہیں۔ اس لئے یہ خدائی کلام ہے۔

پرانی داستانیں دوسری مذہبی کتابوں میں بھی درج تھیں۔ جنہیں ان پڑھ کے لئے پڑھنا ناممکن ضرور تھا۔ مگر کسی نہ کسی طرح سنی ضرور جا سکتی تھیں۔ ان باتوں کے

علاوہ کچھ باتیں سینہ بسینہ بھی چلی آرہی ہوں گی۔ دونوں طریقوں سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی "پرانی بات" ایسی ہے۔ جو نہ تو کہیں کسی کتاب میں ہو اور نہ ہی سینہ بسینہ چلی آرہی ہو۔ تو ایسی بات کی صحت کے متعلق کیا کہا جا سکتا۔ آیا کہ وہ درست ہے یا غلط۔

مرہم کچھ اس طرح رکھیں کہ جلد آرام آجائے۔ اور دل میں کسی وسوسے یا وہم (جو کہ دل میں دو چار سیکنڈ ہی کے لئے آتا ہے) کی گنجائش ہی نہ رہے۔ جب تک اطمینان نہ ہو اُس وقت تک صرف قائل ہونا کوئی فخر کی بات نہیں۔ کیا آپ مجھے فخر کرنے کا موقع نہ دیں گے۔

جواب

مجھے آپ کے ذوقِ تجسس کا معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی۔ اور اس سے بھی کہ میں نے اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق جو کچھ اپنی کتابوں میں پیش کیا ہے اس سے آپ کے بہت سے شکوک رفع ہو گئے اور خدا پر آپ کا اطمینان اس درجہ محکم ہو گیا کہ آپ کا اضطراب، سکون سے بدل گیا۔۔۔ وہ سکون جو عقل وفکر اور علم وبصیرت کی بنا پر حاصل ہوتا ہے، نہ وہ جو جہالت اور تقلید پر مبنی ہوتا ہے اور غور و تدبر اور تنقید و تحقیق سے ختم ہو جاتا ہے۔ (ضمناً) یہ بھی ایک بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ میری انہی کتابوں سے (جنہیں ان میں سے کسی نے کبھی پڑھا نہیں تھا) ہمارے ہاں کے مفتیانِ کرام نے مجھے "خدا کا منکر" لہذا، (معاذ اللہ) ملحد و بے دین قرار دیا تھا۔ اور انہی کتابوں سے آپ، علیٰ وجہ البصیرت، خدا پر ایمان لائے ہیں۔ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا کا یہ کیا عبرت انگیز منظر ہے!

آپ نے بالکل صحیح سمجھا ہے کہ ایمان وہی ایمان ہے جو علیٰ وجہ البصیرت، دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے بعد لایا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ کسی بات کے متعلق اگر دل میں ذرا سا شبہ یا اعتراض پیدا ہو تو اسے رفع کر دیا جائے۔ اگر ناخن میں چبھی ہوئی پھانس نکالی نہ جائے تو وہ ساری رات سونے نہیں دیا کرتی۔

۲۔۔۔ آپ کے سوال کا ملخص یہ ہے کہ یہ کس طرح مانا جائے کہ قرآن کریم، خدا کا کلام ہے، نبی اکرمؐ نے اسے خود ہی وضع کر کے اسے خدا کی طرف منسوب نہیں کر دیا؟

قبل اس کے کہ میں اس سوال کا جواب عرض کروں، آپ کے اعتراضات میں سے دو ایک اہم شقوں کا تجزیہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس سے اصل سوال پر خاصی روشنی پڑے گی۔

آپ نے لکھا ہے کہ "آپ رسول کریمؐ کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ سچے تھے۔ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ امین تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ سب درست۔ مگر یہ اچھائیاں تو نبوت ملنے سے پہلے بھی تھیں"۔

سوال یہ ہے کہ اگر یہ صحیح ہے (اور اس کی صحت میں کسی کو بھی شبہ نہیں) کہ نبی اکرمؐ نبوت سے پہلے سچے تھے۔ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ نبوت ملنے کے بعد ان کی یہ سب خوبیاں ختم ہو گئی تھیں اور وہ راتوں رات ایسے بدل گئے تھے کہ (معاذ اللہ) اتنا بڑا جھوٹ بولنے لگ گئے۔ اور پھر تیئیس[۲۳] برس تک مسلسل جھوٹ بولتے چلے گئے! ایسا کرنے والے کو یا تو اتنا بڑا مکار اور ریاکار ہونا چاہیئے کہ وہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق اس قسم کا دعوےٰ کرے اور پھر اتنے لمبے عرصہ تک اس منافقت، عیاری اور مکاری کو نہایت کامیاب طریق سے نباہتا چلا جائے۔ اور یا وہ ایسا نفسیاتی مریض ہو کہ اپنے توہمات کو خدا کا کلام سمجھ کر اس خود فریبی میں مبتلا ہو جائے کہ وہ مامور من اللہ ہے۔ (اس قسم کی نفسیاتی بیماریاں ہوتی ہیں۔ ہماری طب قدیم میں بھی اس قسم کی علامات کو "نوعے از جنون" کہا گیا ہے)

لیکن رسول اللہؐ کی نبوت کی تیئیس سالہ زندگی ان دونوں باتوں کی تغلیط کرتی ہے۔ مکاری اور عیاری کا پردہ کسی نہ کسی مقام پر ضرور چاک ہو جاتا ہے ـــ بالخصوص جب مخالفین کی ہزاروں نگاہیں اس کی تلاش میں ہوں۔ اور نفسیاتی مریضوں کی ایک ایک حرکت ان کے غیر متوازن ذہن اور تشتت ذات (TORN PERSONALITY) کی غماز ہوتی ہے۔ بعض متعصب پادریوں نے حضورؐ کے خلاف اس قسم کے الزامات بھی لگائے تھے لیکن خود انہی کے ارباب علم و تحقیق نے ان کی تردید کر دی اور برملا کہا کہ آپؐ کی زندگی میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ملتی۔

۳ ـــ آپ نے اس دعوے کے سلسلہ میں (کہ قرآن کا چیلنج ہے کہ اس جیسی کتاب کوئی انسان نہیں بنا سکتا) کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی کوئی کتاب بنائی گئی ہو اور مسلمانوں نے اسے ضائع کر دیا ہو۔

قرآن کا یہ چیلنج، قریش عرب تک ہی محدود نہیں تھا۔ ان سے زیادہ تحدی کے ساتھ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کو بھی دیا گیا تھا۔ یہودی ساری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے اور عیسائیوں کی اتنی اتنی عظیم الشان سلطنتیں موجود تھیں۔ کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی طرف سے اس چیلنج کا جواب دیا گیا ہو اور اس کا کوئی ذکر ان کی کسی تاریخ میں موجود نہ ہو؟ وہ کتاب ضائع کی جا سکتی ہے (حالانکہ جس تسلسل سے عیسائی سلطنتیں ظہور اسلام کے وقت سے لے کر اس زمانہ تک چلی آ رہی ہیں، اس کے پیش نظر ایسا ہونا بھی ناممکنات میں سے ہے) لیکن اس قسم کے واقعہ کے تذکرہ کو ساری دنیا کی کتب تاریخ سے مٹا دینا تو کسی طرح ممکن نہیں۔

پھر قرآن کا یہ چیلنج، اسی دور تک محدود نہیں تھا۔ ساری دنیا کے لئے، اور ہر ایک زمانے کے لئے تھا۔ دنیا نے (بالخصوص عیسائی دنیا نے) اسلام کی مخالفت میں ہر ممکن حربہ استعمال کیا۔ سینکڑوں برس تک صلیبی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ہزارہا کتابیں اسلام کے خلاف لکھی گئیں۔ مناظرے کئے گئے۔ مباحثے ہوئے۔ (اور ہوتے چلے جا رہے ہیں)۔ اگر اس چیلنج کا قبول کر لینا ممکن ہوتا تو مخالفین کو اتنا کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ایک کتاب قرآن کی

شکل لکھ دی جاتی۔ ساری دنیا کے مسلمان شکست کھا جاتے۔

اور اب بھی کونسا، وقت نکل گیا ہے؟ دنیا اس چیلنج کو قبول کر کے اس جھگڑے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کیوں نہیں ختم کر دیتی؟ ذرا سوچئے، کہ یہ سوچنے کا مقام ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ "سرداروں کے ظلم و ستم سے نجات کے لئے بھی تو کھار اسلام قبول کر سکتے تھے"؟ ہو سکتا ہے کہ مظلوم اور مقہور۔ کمزور و ناتواں لوگوں نے اسی طرح اسلام قبول کر لیا ہو۔ (اور اسلام کی برتری کا یہ ثبوت بھی کیا کم ہے کہ وہ مظلوموں اور کمزوروں کی پناہ گاہ ہے!) لیکن سوال یہ ہے کہ ان سرداروں نے اسلام کس طرح قبول کر لیا؟ بلالؓ اور صہیبؓ نے تو مظلومیت سے بچنے کے لئے اسلام قبول کر لیا ہوگا۔ (حالانکہ اسلام قبول کرنے سے ان پر جس قدر ظلم و ستم ڈھائے گئے، وہ ان مظالم سے کہیں شدید تھے جو ان پر اس سے پہلے روا رکھے جاتے تھے) لیکن ابوبکر و عمر، عبدالرحمٰن، اور عثمان۔ طلحہ اور زبیر (رضی اللہ عنہم) نے کن مظالم کے خوف سے اسلام قبول کیا تھا؟ ان کا شمار سردارانِ قریش میں ہوتا تھا!

۴ —— آپ کہتے ہیں کہ گزشتہ زمانے کی جو باتیں قرآن کریم میں مذکور ہیں وہ باتیں پہلی کتابوں میں موجود تھیں، یا سینہ بسینہ چلی آ رہی تھیں۔ اور جو باتیں نئی تھیں، ان کے متعلق کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ صحیح ہیں یا غلط!

گزشتہ زمانے کی جو باتیں کتب سابقہ میں بیان ہوئی تھیں، ان میں، اور جس طرح وہ قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں، ان میں، جہاں جہاں اختلاف ہے (یا جو باتیں صرف قرآن میں بیان ہوئی ہیں) وہ مقامات قابل غور ہیں۔ جوں جوں تاریخی تحقیقات بڑھتی جا رہی ہیں، وہ قرآن کے بیانات کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچاتی جا رہی ہیں۔ یہ مشکل ہے کہ میں ان مقامات کی تفصیل بانشاندہی ایک خط میں درج کر سکوں۔ یہ موضوع بڑا تفصیل طلب ہے۔ ایک آدھ مثال پر غور کیجئے۔ عیسائیوں کے ہاں یہ مسلمہ چلا آ رہا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کی پیدائش، ۲۵ دسمبر کو ہوئی۔ قرآن نے کہا کہ ان کی پیدائش اس موسم میں ہوئی تھی جب کھجوریں درختوں پر پکتی ہیں۔ یہ موسم دسمبر میں نہیں ہوتا۔ گرمیوں کا ہوتا ہے۔ اب خود مغربی محققین اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش (اور آپ کی زندگی سے متعلق دیگر اہم کوائف جس طرح بائبل میں مذکور ہیں)، محض افسانے ہیں۔ اب ان کی تحقیقات کا رخ قرآن میں بیان کردہ واقعات کی طرف ہے۔ ان میں سے بعض کی تصدیق وہ کر چکے ہیں۔ اور جب ان کی تحقیق آگے بڑھے گی تو بقایا کی تصدیق بھی اسی طرح ہوتی جائے گی۔ یا مثلاً، فرعونِ موسٰیؑ کی لاش کے متعلق، کتب سابقہ خاموش تھیں۔ قرآن نے بتایا کہ اسے غرقابی کے بعد، محفوظ رکھ لیا گیا تھا۔ مصری تہ خانوں کی کھدائی نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ فرعون کی ممی شدہ لاش محفوظ رکھی ہے۔

اب میں آپ کے اصل سوال کی طرف آتا ہوں۔ اس ضمن میں مجھے جو کچھ کہنا ہے اس کی طرف آپ نے خود ہی اشارہ کر دیا ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ "باتوں کا عمر، تجربے، کوشش اور دھیان وغیرہ پر بھی دار ومدار ہوتا ہے۔ اور پھر چالیس سال کی عمر تک تو خاصا تجربہ حاصل ہو جاتا ہے۔" اس لئے قرآن میں جو "فلسفیانہ باتیں" ہیں وہ رسول اللہؐ کے اپنے علم و تجربہ کی پیداوار ہو سکتی ہیں۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے جس کی تائید کے لئے کسی دلیل و شواہد کی ضرورت نہیں کہ انسان کتنا ہی زیادہ دانا و بینا کیوں نہ ہو، نہ اس کی معلومات اپنے زمانے کی علمی سطح سے آگے جا سکتی ہیں۔ نہ وہ اپنے ماحول سے غیر متاثر رہ سکتا ہے۔ حتیٰ کہ جن امور کو بڑے بڑے مفکر بطور اپنے فلسفہ کے پیش کرتے ہیں، شعوری اور غیر شعوری طور پر ان قیاسات کا منبع بھی ان کے زمانے تک کا علم انسانی ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ محمدؐ ابن عبداللہ (بحیثیت ایک انسان کے) اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے تھے۔ نہ ان کی معلومات اپنے زمانے کی علمی سطح سے آگے بڑھ سکتی تھیں، نہ وہ اپنے ماحول سے یکسر غیر متاثر رہ سکتے تھے۔ اب دیکھنا یہ چاہیئے کہ زندگی کے جو اصول قرآن نے دیئے ہیں، کیا وہ اس زمانے کی علمی سطح تک محدود تھے یا اس سے آگے جاتے تھے۔ اور آیا ان اصولوں کو پیش کرنے والا، اپنے ماحول سے متاثر ہو کر یہ کچھ کہہ سکتا تھا؟ اس باب میں میری دشواری پھر یہی ہے کہ اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے ایک مبسوط کتاب کی ضرورت ہے۔ خط اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں دو چار مثالوں پر ہی اکتفا کروں گا۔

(۱)　زمانہ نزول قرآن میں، بادشاہت کو، ساری دنیا میں، مسلمہ نظام سیاست و تمدن سمجھا جاتا تھا۔ کہیں راجہ کو ایشور کا اوتار مانا جاتا تھا۔ کہیں بادشاہ کو زمین پر خدا کا سایہ۔ سلاطین کے آسمانی حقوقِ الوہیت کا عقیدہ عام تھا۔ کوئی انسانی ذہن ایسا نہیں تھا جو اس عقیدہ میں کسی قسم کا سقم یا عیب محسوس کرے۔ عین اس زمانے میں عرب کی سرزمین کا ایک اُمّی یہ کہتا ہے کہ یہ عقیدہ بالکل باطل اور یہ تصور یکسر غلط ہے۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت صرف قانون کی ہو سکتی ہے اور قانون بنانے کا اختیار بھی کسی انسان کو حاصل نہیں۔ ان قوانین کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے متنازعہ فیہ معاملات کا تصفیہ، لوگوں کے باہمی مشورہ سے ہونا چاہیئے۔

میں پوچھتا یہ ہوں کہ کیا اس زمانے کا کوئی انسانی ذہن یہ اصولِ حکمرانی دے سکتا تھا؟

(۲) خود خدا کے متعلق یہ عقیدہ، اسی زمانے تک ہی نہیں بلکہ (عام طور پر) آج تک بطور مسلمہ چلا آتا ہے کہ "خدا قادرِ مطلق ہے۔ وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں۔ وہ جسے چاہے خاک سیاہ کر دے جسے چاہے تخت پر بٹھا دے۔ جسے چاہے تباہ کر دے جسے چاہے فروغ دیدے۔ اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے۔ لیکن آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے، ایک شخص یہ کہتا ہے کہ خدا بے شک قادرِ مطلق ہے۔ لیکن اس نے

اس کائنات کے نظام کے لئے خود ہی کچھ قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ اور اب یہاں جو کچھ ہوتا ہے ان قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان ان قوانین کا علم حاصل کر سکتا ہے اس لئے وہ کائناتی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں اپنے کام میں لا سکتا ہے۔ (یہ اُس زمانے میں کہا جا رہا تھا جب دُنیا کائناتی قوتوں کو دیوی دیوتا مانتی تھی)۔ اور اپنی ناکامی کے اسباب وعلل پر غور کر کے، سمجھ سکتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور مجھے کیا کرنا چاہیئے جس سے آئندہ ایسا نہ ہو۔

آپ سوچئے کہ کیا اس زمانے میں یہ کچھ، انسانی ذہن کہہ سکتا تھا؟

(۳) ذات پات کی تمیز اور انسانوں کی طبقاتی تقسیم اُس زمانے کا عام معمول تھا۔ حتیٰ کہ اسے خدائی سند اور برہما کی تخلیق قرار دیا جاتا تھا۔ عین اُس زمانے میں، (اور خود عرب میں جہاں یہ تفریق اپنے انتہا تک پہنچ رہی تھی) یہ کہا گیا کہ ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔ مدارج کا فرق صرف جوہر ذاتی اور سیرت وکردار کی بنا پر ہونا چاہیئے۔

غور کیجئے کہ کیا اس اصول کو بطور ایک غیر متبدل اصولِ حیات، اور مستقل قدر کے پیش کرنا، اُس زمانے کی پیداوار ہو سکتا تھا؟

(۴) اُس زمانے میں جب ایک بستی کے رہنے والے، دوسری بستی والوں کے حالات سے واقف نہیں ہوتے تھے۔ اور دنیا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی، ایک شخص یہ کہتا ہے کہ یہ تقسیم، انسانوں کی خود ساختہ ہے تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری ہے اور اسے آخر الامر ایک قوم بن کر رہنا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ دنیا ایک مشترکہ ضابطہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرے۔ لہٰذا، قبائلی یا قومی تشکیل کا مدار نسل یا وطن کے اشتراک پر نہیں۔ آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ہے۔ ذرا سوچئے کہ یہ تصور اس زمانے کی علمی سطح سے کتنا آگے تھا؟ کیا اس قسم کا تصور انسانی ذہن کی تخلیق ہو سکتا تھا؟

(۵) غلامی اُس زمانے میں ساری دنیا میں بطور ایک مسلّمہ کے رائج تھی اور دنیا کے بلند ترین ذہنوں کے حامل اسے فطرت کا تقاضا اور صحیح انسانی تقسیم قرار دیتے تھے۔ اس زمانے میں یہ اصول پیش کرنا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان کو اپنا غلام بنائے، کیا ماحول کا اثر یا اُس زمانے کی علمی کاوشں کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

(۶) اس زمانے میں جب زمینداری۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری کو معیشت کا متفق علیہ نظام قرار دیا جاتا تھا (اور اس کے خلاف، عرب کے ہمسایہ ملک میں مزدک کی اشتراکی کوشش بری طرح ناکام ہو چکی تھی)، یہ اصول پیش کرنا کہ تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی کا مہیا کرنا نظامِ معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔ اور اس کے لئے رزق کے سرچشموں کو معاشرہ کے کنٹرول میں رہنا چاہیئے۔ دولت جمع کرنا عذاب جہنم کا موجب ہے اور اپنی محنت کے ماحصل کو نوعِ انسان کی بہبود کے لئے کھلا رکھنا جنت کی خوشگواریوں کا باعث — اور اس کے لئے

ایسی محکم بنیادیں مہیا کرنا جن سے یہ نظام کبھی ناکام ثابت نہ ہو۔ غور کیجئے کہ کیا یہ چیز عرب کے تاجرانہ قبیلہ سے متعلق ایک عام فرد کی ذہنی تخلیق ہو سکتی تھی؟

(۷) اس زمانے میں "مذہبی پیشوائیت" دنیائے روحانیت" کا ایسا عقیدہ تھا جس میں کسی کو اختلاف نہیں تھا۔ دنیا کا ہر مذہب، اسے ایمان کا جزو قرار دیتا تھا۔ عین اُس زمانے میں، کسی کا یہ اعلان کرنا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی حاجب اور دربان نہیں۔ یہ احبار و رہبان (علماء اور مشائخ) لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں۔ دین میں ان کی کوئی گنجائش نہیں —— اور یہ اعلان ہو رہا ہے اُس گھرانے کے فرد کی طرف سے جو کعبہ کے متولیوں میں سب سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ کیا یہ تصور، اس شخص کے اپنے ذہن کی تخلیق ہو سکتا تھا؟

(۸) ان اقدار و اصولِ حیات سے ہٹ کر، علمی حقائق کی طرف آیئے تو (مثلاً) علم الافلاک کے متعلق جو کچھ قرآن کریم میں آیا ہے —— تمام اجرامِ فلکی اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ یہ عظیم الجثہ کرے کششِ ثقل کی زنجیروں کے ساتھ بندھے ہوئے مسلسل مصروفِ خرام ہیں۔ زمین اس قدر تیزی سے گھومنے کے باوجود، مخلوق کے لئے رہائش و آسائش کا گہوارہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیا یہ سائنٹفک حقائق، اس زمانے کا انسانی ذہن وضع کر سکتا تھا؟

آپ انہی چند مثالوں پر غور کیجئے اور سوچئے کہ کیا یہ باتیں اس زمانے میں انسانی تجربہ یا کوشش کا نتیجہ ہو سکتی تھیں۔ اور پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ دنیا نے اُس زمانے میں ان باتوں کو جھٹلایا۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دنیا جوں جوں علم، تجربہ اور سائنٹفک تحقیقات و انکشافات میں آگے بڑھتی جا رہی ہے، کیا وہ اُن اصولوں کی طرف آ رہی ہے جو اس رسول نے پیش کئے تھے یا اُن نظریات کو صحیح تسلیم کر رہی ہے جو اس سے پہلے دنیا میں بطور مسلمات مانے جاتے تھے؟ کیا (قرآن کے الفاظ میں) انفس و آفاق کی شہادتیں، قرآنی حقائق کی تائید کر رہی ہیں یا تردید؟ اور کیا آج کا —— اپنے ذہن کے وضع کردہ نظامِ زندگی کے ہاتھوں کا ستایا ہوا انسان، جس قسم کے نظام کو انسانیت کی نجات و سعادت کا ضامن سمجھ کر اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے، وہ نظام وہی نہیں جسے اس رسول نے یہ کہہ کر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا کہ انسان کو آخر الامر اس کی طرف آنا پڑے گا۔

کیا یہ حقائق، اس رسول کے اس دعوے کی صداقت نہیں کہ "میں جو کچھ کہتا ہوں وہ میرے اپنے ذہن کی تخلیق نہیں۔ اس کا سرچشمہ علمِ الٰہی ہے جو بذریعہ وحی مجھے دیا گیا ہے۔" وما ینطق عن الھوٰی۔ ان ھو الا وحی یوحیٰ۔

خدا کرے میری یہ معروضات، آپ کے لئے اس مرہم کا کام دیں جس کی آرزو میں آپ نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ لیکن اگر ابھی کوئی اور بات وضاحت طلب رہ گئی ہو تو میں اس کی مزید تشریح کی بھی کوشش کروں گا، حتیٰ مطلع الفجر۔　　(پرویز)

اِن سے اِسلامی قوانین بنوائیے

ہے دلِ پُر حسرتِ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنّا پر کہ کس مشکل میں ہے

(غیر منقسم) ہندوستان کے مسلمانوں نے ایک خطۂ زمین کا مطالبہ کیا تھا جس میں وہ اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ وہ خطۂ زمین مل گیا۔ اس بات کو سترہ برس سے اوپر ہو گئے۔ لیکن اس ملک میں اسلامی قوانین کا مرتب یا نافذ ہونا تو ایک طرف، ابھی تک یہی طے نہیں ہونے پایا کہ اسلامی قوانین کہتے کسے ہیں اور ان کے مرتب کرنے کا اصول کیا ہے۔ بات مذہبی پیشواؤں کے ہتھے چڑھ گئی ہے اور جو بات ان کے ہتھے چڑھ جائے اس کا حشر کیا ہوتا ہے اس کے متعلق حکیم الامت نے مدت ہوئی کہہ دیا تھا کہ

میں جانتا ہوں انجام اس کا جس معرکے میں مُلّا ہوں غازی

یہی وہ حقیقت ہے جس کے متعلق ہم سترہ برس سے مسلسل و متواتر کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اگر معاملہ مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ ہی میں رہا تو اسلامی قوانین قیامت تک مرتب نہیں ہو سکیں گے۔ جو لوگ تیرہ سو برس میں اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ نماز میں ہاتھ کہاں باندھنے چاہئیں کیا وہ ایک اسلامی مملکت کے لئے ایسے قوانین مرتب کر سکیں گے جو تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر نافذ ہو سکیں؟ یا یوں کہیئے کہ کیا یہ لوگ ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کر سکیں گے جو ان سب کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی کہلا سکے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا اس کی تازہ مثال ملاحظہ فرمائیے۔

پاکستان میں ایک فرقہ حنفی کہلاتا ہے (اگرچہ ان میں بھی باہمی اختلافات ہیں۔ دیوبندی اور بریلوی دونوں حنفی کہلاتے ہیں اور ان دونوں میں آئے دن جو جوتم پیزار ہوتی رہتی ہے اس سے آپ واقف ہیں) دوسرا فرقہ اہلِ حدیث کا ہے

(یہ اہل سنت والجماعت کے فرقے ہیں۔ شیعہ فرقہ ان سے الگ ہے)۔ حنفیوں کی یہاں اکثریت بتائی جاتی ہے۔ اس لئے ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کر دی جائے۔ یہ تجویز مودودی صاحب نے بھی پیش کی تھی ——— اگرچہ وہ فقہ کو "متعین دساتیر" سے تعبیر کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہی تجویز اب مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے پیش کی ہے۔ دوسری طرف اہل حدیث ہیں اور ان کا ترجمان' لاہور سے شائع ہونے والا جریدہ' الاعتصام ہے۔ اب دیکھئے کہ ان دونوں میں اس سوال پر کس طرح کشمکش ہو رہی ہے۔ الاعتصام میں ایک سلسلہ مضامین شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ——— کیا فقہ حنفی اسلام کی کامل اور صحیح تعبیر ہے؟ ——— اس سلسلہ میں الاعتصام کی ۲۵ دسمبر ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں جو کڑی شائع ہوئی ہے اسے ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں لکھا ہے۔

نیو ٹاؤن کراچی کے مدرسہ عربیہ کا ایک ماہوار مجلہ ہے، نام "بینات"۔ یہ رسالہ اور مدرسہ گو فقہ العراق کے ترجمان ہیں لیکن اس کے نگران حضرت مولانا محمد یوسف بنوری علمی حلقوں میں بڑی عزت سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی نظر فقہ اور حدیث دونوں پر ہے۔ ان کے متعلق ہماری رائے یہ تھی۔ وہ اپنے مسلک کی حمایت کے ساتھ اسلام کی عمومی اقدار کا بھی خیال رکھیں گے اور دوسرے متنوع مسالک کے ساتھ بھی وہ انصاف کو نظر انداز نہیں فرمائیں گے۔ لیکن بینات شمارہ ۲ جلد ۳ کا اداریہ دیکھ کر ہماری حیرت کی حد نہ رہی۔ قارئین کرام بھی یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ اتنے اونچے لوگ بھی اس قدر نیچے آسکتے ہیں اور ایسی سطح ... کی بات کہہ سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"اس وقت دنیائے اسلام میں ہماری ہی مملکت وہ مملکت ہے جو اسلام کے نام پر بنی اور اسلامی حکومت کے قیام کے عزم سے قائم ہوئی ہے۔ اس لئے اس کو اسلامی قالب عطا کرنے کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہم ہی پر عائد ہوتی ہے اور سچ یہ ہے کہ اگر عزم صمیم ہو، تو یہ کام ایسا دشوار بھی نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے ملک کی اکثریت بلکہ بڑی غالب اکثریت فقہ حنفی کی پیرو ہے اور جمہوری اصول کے ماتحت جب بھی اسلامی حکومت قائم ہو، اسی فقہ کی ترویج ضروری ہوگی اور یہ وہ فقہ ہے جو نہایت منظم، مدون، محفوظ اور ہر عملی پہلو کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور اس پر صدیوں تک عظیم الشان حکومتیں کامیابی سے چل چکی ہیں۔ اس لئے ہم کو فوری طور پر قانون سازی میں زیادہ وقت لگانے کی ضرورت نہیں، بلکہ ان قوانین کا نفاذ ہمارا پہلا قدم ہونا چاہیئے۔"

"بلاشبہ موجودہ معیشت کے پیدا کردہ مسائل کا حل ہماری قدیم فقہ میں نہیں ملتا اور ان مسائل کو حل کئے بغیر پوری توانائی سے آگے بڑھا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن یہ کام مدونہ قانونِ اسلامی کی تنقید کے ساتھ زیادہ آسانی اور مستعدی سے انجام پا سکتا ہے کیونکہ جب ایک بار فقہ حنفی کی سرکاری حیثیت مسلّم ہو جائے گی۔ تو لازمی طور پر ان نئے مسائل کا حل اسی روشنی میں تلاش کرنا ہوگا۔ تاکہ اہلِ ملک کے لئے قابلِ تسلیم ہو، اور اس کام کے اہل صرف وہی لوگ ہو سکیں گے جو فقہ حنفی کے ماہر ہوں اور جن کے علم و تقویٰ، اجتہاد اور دیانت پر مسلمانوں کو اعتماد ہو۔ اس طرح موجودہ تحقیقاتی رسہ کشی بھی ختم ہو جائے گی۔ میکگل اور ہارٹ فورڈ کے تعلیم یافتہ یا قیادت اور صحافت کی راہ سے بننے ہوئے محققین خود بخود میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

ہم نے یہ ارشاد بار بار پڑھا، اور ہمیں افسوس ہوا۔ اس لئے کہ حضرت مولانا بنوری کی نگرانی میں ملکی اور ملی ضرورت کے متعلق جو کچھ لکھا جائے اس کا معیار اس سے بہت اونچا اور انداز اس سے بہت وسیع ہونا چاہیئے۔ اس کے متعلق تنقیدی گزارش سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آسانی کے لئے اس کا اختصار اور تجزیہ کر لیا جائے۔ اس تجزیہ کے جس حصہ کا انکار فرمایا جائے، ہمیں اس پر اصرار نہیں ہوگا۔

۱۔ یہ ملک اسلامی ہے۔ اس لئے حکومت کا فرض ہے کہ اس کے نظام کو اسلامی قالب عطا کرے۔
۲۔ اور یہ کام اس لئے مشکل نہیں کہ اس ملک کی اکثریت فقہ حنفی کو مانتی ہے۔
۳۔ جمہوری اصولوں کے مطابق اس ملک میں فقہ حنفی کی ترویج ضروری ہے۔
۴۔ فقہ حنفی کے سہارے پر بڑی حکومتیں چلتی رہیں۔
۵۔ معیشت کے نئے مسائل واقعی فقہ حنفی میں نہیں اور ان کے حل کے سوا چارہ بھی نہیں۔
۶۔ فقہ حنفی کو اگر سرکاری حیثیت مل جائے تو اسلامی قانون کے نفاذ میں آسانی ہوگی۔
۷۔ نئے مسائل کا حل فقہ حنفی کی روشنی میں ہونا چاہیئے۔
۸۔ ان مسائل کے حل کے لئے صرف فقہ حنفی کے ماہرین سے کام لینا چاہیئے۔

یہ بالکل درست ہے۔ یہ ملک اسلامی ہے اور اس میں قوانین کو اسلامی قالب دینا چاہیئے۔ مطالبہ عا کے بعد ۲ بالکل بے جوڑ ہے۔ جب آئمہ اربعہ اور ان کی فقہ اور صحابہ اور تمام آئمہ سلف مسلمان ہیں اور وہ سب اسلام کی ترجمانی فرماتے ہیں ۔ تو۔ پھر اسلام کو سکیڑ کر صرف فقہ حنفی کے قالب میں کیوں بند کر دیا جائے فقہ حنفی صرف ایک مکتبِ فکر

ہے جس میں علماءِ عراق کے خیالات اور اہلِ کوفہ کے تصورات کی ترجمانی کی گئی

۱۹۵۲ء میں دستور کے متعلق جو میٹنگ بتیس ۳۲ علماء کی کراچی میں ہوئی تھی۔ اس میں دستوری سطح پر یہ فیصلہ ہوا تھا کہ تمام مکاتبِ فکر کو اپنے نقطۂ نظر کی پابندی کے لئے کھلی اجازت ہوگی۔ حتیٰ کہ سنت کا مفہوم وہی معتبر ہوگا جو اس مکتبِ فکر کے اربابِ حل و عقد کے نزدیک مسلم ہوگا۔ دستور میں اس قدر توسیع اور گنجائش اور قوانین میں یہ تنگ دلی بے جوڑ سی بات ہوگی

جب ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے تو اس میں پورے اسلام کو برسرِ اقتدار رہنا ہے۔ کسی مکتبِ فکر کو بھی خارج البلد نہیں ہونا چاہیئے۔ اختلاف کی صورت میں قضاۃ اور قانونی عدالتوں کو مخصوص اختیارات دیئے جانے چاہئیں کہ جنہیں وہ استعمال کریں اور مختلف مکاتبِ فکر کے لوگوں میں فیصل خصومات کر سکیں یا مخصوص حالات میں کسی مکتبِ فکر کو ترجیح دے سکیں۔ لیکن ملک پر کسی مکتبِ فکر اور اس کی فقہیات کو مسلط نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر واقعی اس ملک میں احناف کی اکثریت ہے تو غیر احناف کی اس سے نہ اہمیت کم ہوتی ہے جب کہ ان کو اہمیت حاصل ہے اور نہ ان کی مشکلات کو نظر انداز ہی کیا جا سکتا ہے۔

(۳) دین کے معاملات میں مروجہ جمہوری اصولوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ آئمہ کی فقہیات کا تعلق دین سے ہے۔ دینی امور کا فیصلہ کبھی مروجہ جمہوری اصولوں کے ماتحت نہیں کیا گیا۔ اگر کوئی سیاسی مسئلہ ہوتا یا کسی دنیوی نزاع کا فیصلہ کرنا پیشِ نظر ہوتا تو خیر جمہوری اصول زیرِ بحث آ سکتے تھے۔ لیکن ـــــ نکاح، طلاق، نماز وغیرہ ـــــ معاملات میں جب شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا ہو تو کسی شخص کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے ضمیر کے خلاف یہ فیصلہ اس لئے قبول کرے کہ یہ اکثریت کا خیال ہے۔ فقہِ حنفی کو قانونی حیثیت تو بڑی بات ہے، اس مغالطہ کا خیال بھی نہیں آنا چاہیئے۔

اکثریت کہاں

آپ فرماتے ہیں، اس ملک میں احناف کی اکثریت ہے۔ میں یہ گذارش کروں گا۔ آپ مختلف طبقات اور ان کے مذہبی خیالات پر نگاہ ڈالیں۔ کیا بریلوی حضرات آپ کے نزدیک یقیناً حنفی ہیں؟ کیا ملک کا عام تعلیم یافتہ طبقہ جس کو ملک کا دماغ کہنا چاہیئے۔ وہ بھی اکثر ان مصنوعی پابندیوں سے آزاد نہیں؟ اور آزاد رہنا نہیں چاہتا۔

اگر آپ بوقتِ ضرورت بریلوی کو اپنا رفیق تصور فرمالیں تو بھی تقلید کے پابند حضرات کچھ زیادہ نہیں ہوں گے۔ ویسے مذہب کے معاملہ میں ایسا تساہل آپ حضرات کے لئے مناسب بھی نہیں ہوگا۔ اکثریت کے شوق میں حنفیت کو بھی خطرے میں نہ ڈال دیں پھر یہ اکثریت کی پناہ دین میں واقعی اگر اصولی کا مقام رکھتی ہو تو کیا فقہ کے مسائل کی چھان پھٹک بھی اس اصل کے ماتحت ہو سکتی ہے؟ کیا جن مسائل میں حضرت امام ابو حنیفہؒ جمہور کے خلاف ہوں، وہاں حضرت امام ؒ

کا مسلک ترک کر دیا جائے۔ اور جمہور کے مسلک کو ترجیح دی جائے؟ جہاں آئمہ ثلاثہ حضرت امام کے خلاف ہوں، وہ بھی ترک کر دیئے جائیں، اور جہاں حضرت امام کے تلامذہ حضرت امام سے اختلاف فرمائیں۔ انہیں خیر باد کہہ دیا جائے!!

پھر اس چیز پر بھی غور فرمائیں۔ آیا آپ کی نظر میں متعارف اصطلاح کے مطابق یہ ملک جمہوری ہے۔ یہ تو درست ہو سکتا ہے کہ چونکہ حکومت نے شہروں، دیہات اور قصبات میں یونین کمیٹیاں بنائی ہیں۔ انہیں جمہوریتوں کا بھی کہیں کہیں نام دیا جاتا ہے۔ جناب اسے اس اصطلاح کے مطابق جمہوری ملک کہہ دیں تو ہو سکتا ہے۔ لیکن اصل جمہوریت کے لئے تو لوگ جیلوں کی زیارت پر مجبور ہیں۔ اس وقت ساری جمہوریت لپیٹ کر کنونشن مسلم لیگ کے پیٹ میں رکھ دی گئی ہے۔ یہ جمہوری اصولوں کی بات جناب کس دنیا میں فرما رہے ہیں۔

فقہ حنفی اور حکومتیں

مولانا! پچھلی تاریخ پر غور فرمائیں۔ آیا واقعی جو بڑی بڑی حکومتیں مذہباً حنفی تھیں، وہ فقہ حنفی پر چلتی بھی رہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ حکومتیں اپنے مادی اسباب اور قوت کے سہارے چلتی رہی ہیں۔ یعنی چلنے کی اصل وجہ قوت تھی۔ فقہ نہ تھی۔ بلکہ ایسے واقعات آپ کو تاریخ میں ملیں گے کہ جب کوئی فقہ یا کوئی فقیہہ حکومت کی خواہشات کی راہ میں حائل ہوا تو اسے زور بازو سے ہٹا دیا گیا۔

چنانچہ دیکھئے کہ اس وقت بھی حکومت "حنفی" ہی ہے۔ آپ صدر ایوب صاحب سے دریافت فرمائیں! ان کے وزراء سے پوچھیں۔ وہ فرمائیں گے ہم حنفی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ مطالبہ فرما رہے ہیں کہ اس ملک میں فقہ حنفی کو قانونی حیثیت دی جائے۔ بادشاہ کا حنفی ہونا اور بات ہے اور ملک کا قانون قرار پانا دوسری بات ہے۔

پھر کسی فقہ کے سہارے پر کسی حکومت کا چلنا اس کی صداقت یا صحت کا ثبوت نہیں۔ پورے یورپ میں "لادینی فقیہوں" کے سہارے بڑی بڑی بادشاہتیں چل رہی ہیں۔ رومن فقہ اور کمیونزم کی فقہ دونوں دو بڑے عظیم الشان ملکوں کے قانون کی اساس ہیں۔ ان ملکوں کی مادی قوتوں کا یہ حال ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کو بھی مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان "فقیہوں" کے تقاضوں کو قبول کریں۔ یہ کوئی دلیل نہیں، کوئی فقہ ہو جس کی سرپرستی حکومت کرے وہ نظام اسی سرپرستی کے سہارے پر چلے گا۔ یہ فقہ کی خوبی نہیں، سرپرست کی خوبی کہی جا سکتی ہے۔

پھر یہ فقہ حنفی پر کیا موقوف ہے۔ ائمہ اربعہ کا فقہوں کے اعتماد پر کئی حکومتیں چلتی رہیں۔ حجاز، مصر، یمن، خراسان وغیرہ ممالک میں شافعی حکومت رہی۔ الجزائر، بربر اور مغرب کے کئی ممالک میں سلفی الخیال حکومت کرتے رہے۔ اندلس پر مالکی اسی طرح حکومت کرتے رہے جس طرح کئی سال ہندوستان اور افغانستان پر حنفی حکومت کرتے رہے۔ ایران پر مدت سے روافض حکومت کر رہے ہیں۔ یہ حق کے لئے کہاں تک دلیل ہو سکتی ہے؟ — یہ معلوم نہیں کہ جن ممالک پر حنفی فقہ کے تعاون سے حکومت ہوتی رہی، ان ممالک میں دوسرے مکاتب فکر کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا۔ جبراً ان پر فقہ حنفی ٹھونسی گئی

یا ان کو ان کی صوابدید کے مطابق عمل میں مراعات دی گئیں اور آپ حضرات کی طرح درخواست کر کے فقہ حنفی کو مسلط کیا گیا۔

متوازن مشورہ

ہماری رائے تو یہ ہے کہ اس ملک میں پورے اسلام کو موقع ملنا چاہیئے۔ تمام مکاتبِ فکر کھلے طور پر اپنی اپنی فقہ پر عمل کریں اور لوگ آزاد ہوں کہ جس مسئلہ میں چاہیں جس مکتبِ فکر کو پسند کریں اسے اپنا لیں اس پر عمل کریں اور کوئی تعصب نہ ہو۔ اس لحاظ سے یہ ملک دنیا کے لئے مثالی ہو کہ اس میں کسی عصبیت کے لئے کوئی جگہ نہ ہو۔ (الاعتصام کا اقتباس ختم ہوا۔ اس کے بعد طلوعِ اسلام کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے)۔

آپ نے "بیّنات" کی تجویز اور اس پر الاعتصام کا تبصرہ ملاحظہ فرما لیا۔ سوال زیرِ غور یہ تھا کہ ملک میں ایسے قوانین نافذ کئے جائیں جن کا اطلاق تمام مسلمانوں (یعنی مختلف فرقوں کے مسلمانوں) پر یکساں طور پر ہو سکے۔ اور اس سلسلہ میں تجویز یہ کیا جا رہا ہے کہ ہر فرقہ کو اجازت ہو کہ وہ اپنے اپنے مسلک کے مطابق عمل کر لیا کریں!

حنفی حضرات کو تو چھوڑیئے کہ وہ اپنے ائمہ کی مرتب کردہ فقہ کے متبع ہیں۔ ہم الاعتصام سے ــــ جو سنتِ رسول اللہؐ کے اتباع کا مدعی ہے ــــ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ

1. کیا رسول اللہؐ کے زمانے میں بھی اسلامی قوانین کا اتباع اسی طرح ہوتا تھا۔ کہ ہر فرقہ کا مسلمان اپنے اپنے مسلک کے مطابق عمل کرتا تھا؟
2. اگر رسول اللہؐ کے زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا تو کیا ایسا کرنا خلافِ سنت (یعنی بدعت) نہیں ہوگا؟
3. کیا رسول اللہؐ کے زمانے میں بھی مسلمانوں میں مختلف فرقے تھے۔
4. کیا قرآن کریم نے فرقوں کے وجود کو شرک قرار نہیں دیا؟ $(\frac{30}{32-31})$
5. کیا نبی اکرمؐ کو خدا نے یہ نہیں کہا تھا کہ جو لوگ دین میں فرقے پیدا کر لیں ان سے تیرا کوئی واسطہ نہیں $(\frac{6}{160})$
6. کیا مسلمانوں سے خدا نے یہ نہیں کہا تھا کہ تم فرقوں میں نہ بٹ جانا اور باہمی اختلافات نہ کرنے لگ جانا۔ اس لئے کہ جو لوگ ایسا کریں ان پر خدا کا عذاب ہوتا ہے۔ $(\frac{3}{104})$
7. الاعتصام کی پیشانی پر جو قرآن کریم کی جو آیت درج ہوتی ہے۔ یعنی وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا کیا اس کی عملی تفسیر یہی ہے کہ ہر فرقہ اپنے اپنے مسلک کے مطابق عمل کیا کرے؟
8. کیا آپ کے نزدیک اب کوئی صورت ایسی نہیں جس سے تمام مسلمانوں کیلئے واحد ضابطۂ قوانین مرتب ہو سکے۔ اگر اسکا جواب نفی میں ہے (یعنی آپکے نزدیک اب ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہو سکتی) تو کیا اسکا صاف مطلب یہ نہیں کہ اب اس دنیا میں کوئی صورت نہیں رہی جو اسلام نبی اکرمؐ کے زمانے میں رائج تھا؟

ہم شکر گزار ہونگے اگر ہمارا محترم معاصر الاعتصام، ان سوالات کا جواب اپنے ہاں شائع کرے۔ یا انہیں اشاعت کیلئے بھیجدے۔ ہم اسے بخوشی شائع کرینگے۔ اس سے بہت سے شکوک رفع ہو جائیں گے۔ اور بہت سی الجھنیں دور۔

محترم خان عبدالحکیم خان (مردان)

"دُنیا میں جہنم کی زندگی"

میں نے گذشتہ کنونشن میں "دُنیا میں جنّتی زندگی" کے زیرعنوان ایک مقالہ پیش کیا تھا کہ اور اُس میں اپنے فہم کے مطابق قرآن کریم کی روشنی میں عرض کیا تھا کہ جنّتی زندگی نہ صرف مرنے کے بعد نیک اور اللہ تعالیٰ کے تابعدار لوگوں کو ملتی ہے بلکہ اُن کی اس خوش گوار زندگی کی ابتدا اِسی دنیا ہی سے ہو جاتی ہے اور مرنے کے بعد دوسری زندگی میں بھی اس کے انعامات اور حسنات انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔

اب میں اس مجلس میں قرآن کریم ہی کی آیات سے یہ واضح کرنے کی کوشش کروں گا کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب بھی اسی طرح نافرمان اور سرکش لوگوں کے لئے اِسی دُنیا سے شروع ہو جاتا ہے اور اگر اُن کا یہ رویّہ بدستور رہا تو آخرت کی زندگی میں بھی عذاب اُن کا ساتھ نہیں چھوڑتا، اور قرآن کریم کے اپنے الفاظ وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (۱۷/۷۲) کے مطابق نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ نتیجہ ایسا اٹل ہے کہ اِس دُنیا میں بھی پریشانی، بے اطمینانی، تباہی، خوف اور عذاب ہوتا ہے اور آخرت میں بھی۔ جہاں کوئی قوم مرکز سے ہٹی، حبل اللہ (یعنی قرآن کریم کے قانون) کو پس پشت ڈال دیا، ظلم و عدوان پر کمر باندھی، تو تباہی کے گرداب میں آگئی اور ذلّت و مسکنت میں پھنس گئی یہی وہ محسوس معیار ہے جس سے دیکھا جا سکتا ہے کہ کسی قوم کے اعمال قوانینِ خداوندی کے مطابق ہیں یا نہیں۔

قرآن کریم ایک اصول کے طور پر سورۃ الحجر میں اپنے ایک قانون کا اعلان کرتا ہے وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ (۱۵/۴) یعنی ہم نے کسی قوم کو اُن کی مہلت کا وقفہ پورا ہونے سے پہلے تباہ نہیں کیا، یہ وقفہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق متعین ہوتا ہے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں غلط روش کے نتائج ٹھیک اپنے وقت پر ظہور میں آتے ہیں۔

قرآن کریم کے اِس اٹل اور محکم اصول کا بار بار ذکر کیا گیا ہے ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے ــــ

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ہم نے ہر قوم میں کسی نہ کسی رسول کو بھیجا کہ وہ اُن سے کہدے کہ وہ صرف ایک خدا کے احکام کی اطاعت کریں اور ہر غیر خداوندی اقتدار کی محکومیت اور فرمان پذیری سے باز رہیں فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ سواُن میں سے بعض نے قانونِ خداوندی کے مطابق صحیح راستہ اختیار کر لیا اور بعض نے اُس سے انکار کیا تو گمراہی اُن پر ثبت ہوگئی، فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (۱۶/۳۶) سو تم مختلف ممالک میں ذرا پھرو اور اقوامِ عالم کے تاریخی واقعات و آثار پر غور کرو اور دیکھو کہ جن قوموں نے خدا کے احکام اور قوانین کو جھٹلایا تھا اُن کا انجام کیا ہُوا۔ یہ تاریخی واقعات و آثار اِن کی تباہی کی داستانیں سُنا رہے ہیں اور ایسی مبنی بر حقیقت ہیں کہ ہزاروں سال گذر گئے لیکن اِن واقعات سے سرِ مُو اختلاف کسی کو نہ ہو سکا۔

عہدِ عتیق میں عاد و ثمود، فراعنۂ مصر اور اکاسرۂ عجم کی عظیم الشان فرمانروائیاں، ترقی و تہذیب میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں، لیکن اُنکی بداعمالیاں آخرکار عذابِ الٰہی کا باعث بن گئیں اور اُن کی خوشگوار زندگی جہنمی زندگی میں بدل گئی۔ قرآن کریم تمثیلی انداز میں ایسے ایک ملک کا ذکر سورۃ النحل میں یوں فرماتا ہے وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً ۔ اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے ایک ملک کا حال مثالاً پیش کرتا ہے، وہاں کے باشندے بڑے خوشحال اور فارغ البال تھے، امن و اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّن كُلِّ مَكَانٍ ۔ ہر طرف سے فراغت و فراوانی کے ساتھ دولت و زر کے انبار اور رزق و نعائم کے جہاز اُن کی طرف بھرے چلے آ رہے تھے، پورا عیش تھا اور مکمل اطمینان، فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۱۶/۱۱۲) لیکن اُنھوں نے اس کی قدر نہ کی، نافرمانیوں اور ناشکریوں پر اُتر آئے آخر خدا کے قانونِ مکافات نے اُنہیں اِس کی سزا (اس دنیا میں) دی اور بھوک و خوف کے جان لیوا عذاب میں مبتلا کر دیا اور یہ سب کچھ اُن کے غلط اعمال کا نتیجہ تھا۔

اِن سابقہ جبار اور قہار قوموں کی قوت و طاقت اور دبدبہ و طنطنہ کا ذکر کرتے ہُوئے اہلِ عرب کو عموماً اور قریش کو خصوصاً متنبہ کیا گیا ہے کہ تم اِس معمولی جاہ و جلال پر نہ اِترایا کرو، تمہاری حیثیت ہی کیا ہے ہم نے تم سے پہلے نافرمانی اور حکم عدولی کے جرم میں بڑی بڑی جابر اور قاہر سلطنتوں کو خاک میں ملایا ہے یہ اپنی ثروت و دولت کے نشے میں بدمست تھا اور سمجھتے تھے کہ ان کا نظامِ زندگی جس سے انہیں اِس قدر خوشحالی اور فراوانی حاصل ہے انہیں کبھی تباہی کی طرف نہیں لیجا سکتا سورۃ انعام میں ارشاد ہے أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِن

قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ کیا انھوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ان سے پہلے کتنی قومیں تباہ ہو چکی ہیں جنہیں اس قدر ثروت اور سطوت حاصل تھی جو تمہیں بھی حاصل نہیں وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا وَّ جَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ اُن پر رزق کی فراوانیوں کی بارش ہوتی تھی اور معاشی خوشحالیوں کی نہریں بہتی تھیں فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ لیکن وہ اپنی غلط نظامِ زندگی کی وجہ سے (جس میں عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کی بجائے محدود مفاد پرستی کو پیشِ نظر رکھا گیا تھا) تباہ و برباد ہو گئیں وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝ (۶/۶) اور نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی جگہ دوسری قومیں ان نعمتوں سے نوازی گئیں یہی قریش فخر و نخوت کے گھمنڈ میں مسلمانوں کا تمسخر اڑانے لگے اپنی شادزوری اور جاہ و جلال کے مقابلے میں اُن کو پرِ کاہ کے برابر نہیں سمجھتے تھے لیکن اُن کا زور و قوت، شان و شکوہ ایک ہی جنگِ بدر میں ختم ہو گیا۔ اور قرآنی سرٹیفکیٹ کہ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کے بموجب ایک بے وست و پا اور ایک چھوٹی سی جمعیت نے اُن کو وہ شکستِ فاش دی کہ بقیہ زندگی میں وہ فتح و کامیابی کے لئے ترستے رہے اُن کی سمجھ سے یہ بات باہر تھی کہ ان کو یہ عذاب کیوں کر اور کہاں سے پہنچا فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ (۳۹/۲۵) اللہ کے قوانین سے بغاوت کی سزا انہیں اس دنیا میں ذلت و خواری کی شکل میں ملی فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۳۹/۲۶)

خیال رہے کہ یہ تنبیہہ اور یہ مخاطبہ زمان و مکان کے حدود کا پابند نہیں جس طرح یہ چیلنج ڈیڑھ ہزار سال قبل جاندار تھا اور نتائج کا حامل تھا اسی طرح بلاشک و شبہ آج بھی زندہ اور نتیجہ خیز ہے جن لوگوں کے سامنے حقیقت میں اللہ کا پیغام یعنی قرآن کریم سامنے نہ رہے تو وہ آباؤ اجداد کی غلط رسموں کو بہت مقدس سمجھتے ہیں اور اُس کے ادا کرنے کو "ثواب" کا کام جانتے ہیں ان لوگوں کے متعلق قرآن کریم کا فیصلہ ہے بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ (۱۳/۳۳) حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس اُن کے دعوے کی صداقت کی دلیل کوئی نہیں محض جذبات سے کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے اُنہیں اپنی تدابیر بڑی خوش آیند دکھائی دیتی ہیں اور اس وجہ سے یہ صحیح راستے کی طرف آنے سے رک گئے ہیں لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ ان کے غلط روش کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ان پر اس دنیا کی زندگی میں بھی تباہی آئیگی اور آخرت کی تباہی اس سے بھی زیادہ جگر پاش ہو گی۔

قرآن کریم کا اُسلوبِ بیان اس انداز کا ہے کہ پہلے ایک بات عمومیت کے رنگ میں بیان فرماتا ہے

اور سمجھانے کی غرض سے مثالیں دے کر خصوصیت کا پیرایہ اختیار کرلیتا ہے۔ ان سرکش اور بے مہار ملوکیتوں میں ایسی ایک ملوکیت فرعون کی بھی تھی جس کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو تیار کیا گیا۔ اُن کو حکم دیا گیا اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۷۹/۱۷) آپ فرعون کے پاس جائیے وہ انسانیت کی حدود سے تجاوز کرنے لگا ہے اُسے سمجھائیے۔ وہ گئے لیکن فَكَذَّبَ وَ عَصٰى (۷۹/۲۱) اُس نے اُن کو جھٹلایا اور احکام کی تابعداری سے انکار کیا اور جواب میں کہا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۷۹/۲۴) تمہارا سب سے بڑی ربوبیت کرنے والا تو میں ہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ وقت کے لئے مہلت دی لیکن جب مہلت کا وقفہ پورا ہوا تو قانونِ مکافات کی گرفت کی گھڑی آن پہنچی۔ اور فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ تو ہم نے اُس کو اور اُس کے تابعداروں کو پکڑ کر دریا برد کر لیا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۲۸/۴۰) پس سوچئے کہ نافرمانوں اور ظالموں کا کتنا بُرا انجام ہوتا ہے۔ وَ اَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً (۲۸/۴۲) اس طرح ہم نے اُن کو اِس دنیا میں ذلیل اور رسوا کر دیا۔ اس ذلت و رسوائی کی شکل کیا تھی؟ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ (۲۶/۵۷-۵۸)۔ ہم نے انہیں ان کے باغات اور چشموں، خزانوں اور باعزت کے مقامات سے باہر کیا۔ اور اس طرح انہیں وہ کچھ دکھا دیا جس کے دیکھنے سے وہ لرزاں و ترساں رہتے تھے (۲۸/۶)۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی جہنم کی زندگی اور کیا ہو گی۔

اسی طرح فرعون اور اہلِ فرعون کے بارے میں ایک دوسرے مقام پر قرآن کریم کا ارشاد ہے كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ۔ اسی طرح قوم فرعون اور اس سے پہلے جو نافرمان قومیں گذر چکی ہیں اُنہوں نے بھی خداوندی قوانین سے سرکشی برتی فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ تو اُس کے قانونِ مکافات نے اُنہیں اُن کے جرائم کی پاداش میں پکڑ لیا اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ بے شک خدا کا قانونِ مکافات بڑی قوت والا اور مواخذہ کرنے میں بڑا ہی سخت ہے ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ۔ یاد رکھو یہ سب اس لئے ہوا کہ خدا کا یہ محکم قانون ہے کہ وہ زندگی کی جو خوشگواریاں کسی قوم کو عطا کرتا ہے اُن میں اُس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں کرتا حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ جب تک وہ قوم خود اپنے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی نہیں پیدا کر لیتی جس سے وہ اِن خوشگواریوں کی اہل نہ رہے۔

اسی طرح گذشتہ دونوں عالمگیر لڑائیوں میں کیا ہوا؟ وہ بڑی بڑی طاقتیں وہ اصحابِ شوکت و جبروت ایسے ہراساں اور پریشان ہو گئے کہ اُن کو معلوم نہ ہو سکا کہ اُن کو اِس تباہی نے کیسے آلیا کوئی اپنی فوجوں پر نازاں تھا۔ کوئی میجنولائین اور سیگفریڈ لائین کو حصار خداوندی سے کم نہیں سمجھتا تھا ہر ایک اپنے ملک کے رزق و نعائم

کی فراوانی میں مست تھا۔ زر و جواہر کے انباروں میں غرق تھا کسی کو یہ وہم بھی نہ تھا کہ اس قسم کی فرمانروایاں اور عیش فراوانیاں زوال آشنا ہو سکیں، مگر اس عیش و عشرت کی زندگی میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قوانین کو سامنے نہ رکھا اور اس طرح ان کا سفینۂ عظمت گرداب بلا میں پھنس گیا حالانکہ ان کو گمان بھی نہ تھا کہ ایسا ہوگا
أَفَأَمِنَ الَّذِينَ مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ أَن يَخْسِفَ اللَّهُ بِهِمُ الْأَرْضَ۔ یہ لوگ جو تخریبی
چالیں چلتے اور ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں کیا اس بات سے بالکل مطمئن ہو چکے ہیں کہ ان کی قوتیں ماند پڑ جائیں
اور انہیں ملک میں ذلیل و خوار کر دیا جائے أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ (۱۶/۴۵)
یا ان پر کسی ایسے مقام سے تباہی آ جائے جو ان کے عقل و شعور میں بھی نہ ہو۔ أَوْ يَأْخُذَهُمْ فِي تَقَلُّبِهِمْ
فَمَا هُم بِمُعْجِزِينَ (۱۶/۴۶) یا وہ انہیں ایسی حالت میں پکڑ لے جب یہ اپنی سکیموں کو بروئے کار
لانے کے لئے بھاگ دوڑ اور الٹ پھیر کر رہے ہوں۔ یاد رکھو! یہ لوگ خدا کے قانون مکافات کی گرفت
سے بچ نہیں سکتے نہ ہی اسے بے بس کر سکتے ہیں۔ أَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلَىٰ تَخَوُّفٍ (۱۶/۴۷) یا پھر وہ ان کی
قوتوں کو آہستہ آہستہ کم کر کے انہیں بالآخر ختم کر دے۔

ان دو جنگوں میں یہی کچھ ہوا۔ کسی زمانے میں فرانس، برطانیہ، جرمنی اور اٹلی دنیا کی عظیم مملکتیں شمار ہوتی تھیں اور ان کے ماتھے کی ایک شکن سے حکومتوں کے نقشے دنوں میں بدل جانے تھے لیکن خود بھی بطش شدید سے بچ نہ سکے اور ان کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا جو وہ دوسروں کے لئے روا سمجھتے تھے۔ اب تیسری عالمگیر جنگ کی تیاری ہو رہی ہے اور قرائن بتا رہے ہیں کہ روس اور امریکہ کا بھی یہی انجام ہونے والا ہے المختصر اب یہ صاف نظر آ رہا ہے کہ جابر سے جابر اور مہیب سے مہیب حکومت کیوں نہ ہو اس دنیا میں اس کا تسلط ہرگز ہرگز مستقل طور سے قائم نہیں ہو سکتا جب تک وہ ایسے نظام کو عملاً رائج نہ کرے جیسے قرآن کریم پیش کرتا ہے قرآن کریم ایسا نظام پیش کرتا ہے جس میں گوروں کو کالوں پر فوقیت نہ ہو، جس میں ملک و نسل کا امتیاز نہ ہو، جس میں جاگیردار کا پسینہ دہقان کے خون سے قیمتی نہ ہو، جس میں یہ بات نہ ہو کہ سردار کا جسم تو زرکار عباؤں سے آراستہ ہو لیکن مزدور کے پاس جسم ڈھانکنے کو بوسیدہ سا چیتھڑا بھی نہ ہو اور نہ ہی یہ کہ اس میں سرمایہ دار کے کتے تو دودھ اور ڈبل روٹی کے ساتھ ناشتہ کریں۔ لیکن اس کا پڑوسی انسان اپنے اور اپنے بچوں کے لئے دنوں کی سوکھی روٹی کو پانی میں بھگو بھگو کر بھوک مارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ قرآن کریم ایسا نظام پیش کرتا ہے جسے دوام حاصل ہو اور دوام اس نظام کو حاصل ہے جو بنی نوع انسان کے لئے نفع بخش ہو یعنی جس کا مقصد صرف انسانیت کی خدمت ہو۔ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)

قرآن کریم نے ڈیڑھ ہزار سال قبل مسلمانوں کو بھی متنبہ کیا تھا کہ کوئی قوم میری لاڈلی نہیں ہے۔

میرے قوانین تمہارے سامنے ہیں۔ یاد رکھو! اگر تم نے بھی ان قوانین سے منہ پھیرا تو تم پر بھی قانون مکافات کی رو سے تباہی و ہلاکت مسلط ہو جائے گی۔ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) اے مخاطبین قرآن اگر تم ہمارے قوانین پر عمل پیرا نہ رہے تو یاد رکھو تمہاری جگہ اس ملک کا تسلط اور امامت ایک دوسری قوم کو دے دی جائے گی اور وہ قوم تمہاری طرح نہ ہوگی بلکہ صرف ہمارے قوانین کی تابعدار ہوگی۔ غرض قرآن شریف ایسی تنبیہات اور اعلانات سے بھرا پڑا ہے۔ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۴/۱۷) کیا اس سے کوئی سبق اخذ کرنے والا زندہ انسان موجود ہے۔

آخر میں سورۃ طٰہٰ کی مشہور آیت وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا (۲۰/۱۲۴)۔ (یعنی جس نے ہمارے احکام کو ٹھکرا دے تو اس کی زندگی تنگی میں گذرے گی) پر غور فرمائیں اس میں کتنی وضاحت اور صاف لفظوں میں چیلنج دیا گیا ہے کہ ہمارے قوانین سے انکار اور سرکشی کا لازمی نتیجہ معیشت کی تنگی ہے اور معیشت و روزی کی تنگی اس دنیا کے علاوہ اور کہاں ہو سکتی ہے؟ اور اسی معیشت کی تنگی سے یہ دنیا جہنم بن جاتی ہے۔

ہمارے مولوی صاحبان جو اس دنیا کو جیل خانے سے تعبیر کرتے ہیں اور آخرت کی خوشحالی اور فوز و فلاح کا انحصار اس دنیا کے مصائب کے تناسب پر بتاتے ہیں، اس آیت کی تفسیر عجیب غریب انداز میں کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیے کہ مولانا اشرف علی صاحب نے ایک اصولی اور اٹل نتیجے کو کس طرح بازیچۂ اطفال بنایا ہے اور معیشت کی تنگی کو کس طرح ایک انوکھے انداز میں بزعم خویش حل کیا ہے۔ اس ٹکڑے کی اپنے "بیان القرآن" میں تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "قیامت سے پہلے دنیا اور قبر میں تنگی کا جینا ہوگا" پھر مزید تشریح فرماتے ہیں کہ "مَعِیْشَةً ضَنْكًا قبر میں تو ظاہر ہے کہ قبر کا فشار تنگ اور طرح طرح سے اس پر عذاب ہوگا اور دنیا میں تنگی باعتبار قلب کے ہے" اور پھر اگلے فقرے میں دنیا کا لفظ ہی سرے سے ہٹا دیا اور فرمانے لگے "آیت میں مطلق مَعِیْشَةً ضَنْكًا آیا ہے اگر کسی کو صرف قبر ہی میں مَعِیْشَةً ضَنْكًا ہو تب بھی یہ حکم صادق ہے خوب سمجھ لو" (بیان القرآن از مولانا اشرف علی صاحب صفحہ ۶۳۳)

غرض اس کی تاویل، تفسیر اور تشریح کس طرح بھی کی جائے اس سے نتیجہ نہیں بدلا جا سکتا ہے ہمیں چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ کے قوانین کے مطابق عمل کریں ورنہ بصورت دیگر ہمیں ان نتائج کا سامنا کرنا ہوگا جو ہم امروز کے عمل سے فردا کے لئے بھیج رہے ہیں مکافات عمل سے بے نیازی نتیجہ نہیں بدل سکتی ہے۔

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافات عمل غافل مشو

رابطہ باہمی

کراچی۔ درسِ قرآن کا سلسلہ کامیابی سے جاری ہے۔ اس کا اعلان وہاں کے اخبارات میں بھی شائع ہوتا ہے۔ اتوار کو پاکستان چوک میں لیلۃ القدر کی تقریب پر پرویز صاحب کے درسِ قرآن کا ٹیپ سنایا گیا۔ جسے بے حد پسند کیا گیا۔ بزم نے یہ طے کیا ہے کہ سندھ اسمبلی ہال سے ہفتہ وار درسِ قرآن کے علاوہ شہر کے دیگر مقامات پر بھی بذریعہ ٹیپ پرویز صاحب کے درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ اس طرح قرآن کی دعوت فکر وسعت پذیر ہو کر عوام تک پہنچ سکے گی۔ اطلاع ملی ہے کہ بزم ۱۶ر فروری کو جشنِ نزولِ قرآن بھی منا رہی ہے۔

سرگودھا۔ ۔ر فروری کو بزم کا ماہانہ اجلاس چوہدری ارشد محمود صاحب کی قیام گاہ پر ہوا۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں احباب کی سابقہ مساعی کا جائزہ لیا گیا اور آئندہ کے لیے ان کوششوں کو بیش از پیش آگے بڑھانے کا سب نے عزم کیا۔ گشتی سفیر کے ذریعے گذشتہ ماہ ضلع کے مختلف قصبوں مثلاً بھلوال، بھیلوال، شاہ پور بیانی۔ شاہ پور صدر اور سردار پور ٹوانہ میں پمفلٹوں کی تقسیم کی گئی۔ بھلوال کے احباب بزم کے قیام کے لیے تیار ہیں اور جلد ہی وہاں بزم کا قیام عمل میں آ رہا ہے۔ دیگر قصبوں میں بھی قرآن کی دعوتِ انقلاب نے اہلِ فکر و بصیرت کو کافی متاثر کیا ہے۔ پمفلٹس کی تقسیم کے علاوہ بزم اور اس کے اراکین نے اپنے ہاں سے مختلف کتب برائے مطالعہ دے رکھی ہیں۔ اور بعد مطالعہ وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

ڈیرہ غازی خاں۔ بزم کا خصوصی اجلاس طلب کیا گیا جس میں محترم مشتاق احمد چغتائی سال رواں کے لیے نمائندہ منتخب کر لئے گئے۔ محترم مقبول احمد چیمہ نے اراکین بزم سے خطاب کرتے ہوئے انہیں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لیے سرگرمِ عمل ہونے کی تلقین کی۔ احباب نے پوری سرگرمی سے کام کرنے کا یقین دلایا اور طے ہوا کہ بزم کا ہر رکن سال میں بزم کا ایک نیا رکن یا طلوعِ اسلام کا ایک نیا خریدار بنائے۔ سالانہ میلہ اسپاں پر ایک بک سٹال قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ جہاں سے تحریک کا لٹریچر تقسیم کرنے کا اہتمام کیا جائیگا، بزم بستی برمانی کے احباب سے بھی اس میں شمولیت کی استدعا کی گئی ہے۔

لاہور۔ بزم پورے عزم اور جوش و خروش سے سرگرمِ عمل ہے اور باقاعدگی سے اس کے اجلاس ہو رہے ہیں۔ گذشتہ ماہ سے اسکے اراکین کی تعداد میں قابلِ ذکر اضافہ ہوا ہے۔ اور یہ تعداد بڑی تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔

۱۷- جنوری کو وائی۔ایم۔سی۔اے ہال میں بزم کے زیر اہتمام "یوم بدر" کی تقریب منائی گئی۔ ہال کے اندر اور باہر تمام نشستیں حاضرین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ ناظم ادارہ محترم صفدر سلیمی صاحب نے اجلاس کی صدارت کی۔ اس موقع کے لئے مفکر قرآن کے خطاب کا اعلان بذریعہ پوسٹر کیا گیا تھا۔ تلاوت کلام پاک نظم اقبال اور مختصر تعارفی خطبات کے بعد محترم پرویز صاحب مائیک پر تشریف لائے۔ اور انہوں نے قرآن کریم اور تاریخ کی روشنی میں "یوم بدر" کی انقلاب آفرین عظمت کو واضح کیا۔ خطاب اپنی نوعیت کا بے مثال اور انتہائی دل نشین خطاب تھا اور معرکہ بدر کی تاریخی اہمیت قرآنی حقائق کی روشنی میں نکھر اور ابھر کر حاضرین کے سامنے آ رہی تھی۔ بدر کے واقعہ کو عام طور پر ایک تاریخی جنگ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن مفکر قرآن نے خود قرآن کریم کی زبان سے یہ واضح کیا کہ یہ معرکہ عام واقعات کی طرح محض ایک جنگ کے مرادف نہیں تھا بلکہ فکر و عمل کی تاریخ میں ایک عظیم ترین انقلابی موڑ تھا جس نے نوع انسانی کا رُخ ایک بالکل نئی منزل کی طرف پھیر دیا۔ اس نے خون، وطن، رنگ، اور نسل کے تمام رشتے کاٹ کر دین و ایمان کے اشتراک پر انسانی اخوت اور قومیت کا ایک نیا رشتہ استوار کر دیا۔

۳۱- جنوری کو محترم پرویز صاحب کی قیام گاہ پر ایک اور یادگار اجتماع ہوا جس میں مفکر قرآن کے خطاب کا موضوع تھا — ہم عید کیوں مناتے ہیں؟

اس اجتماع میں بھی اہل علم و ذوق کی حاضری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ محترم پرویز صاحب نے قرآن کی زبان سے یہ واضح کرتے ہوئے کہ عید الفطر در حقیقت جشن نزول قرآن کی سالگرہ ہے حاضرین کے سامنے اپنے مخصوص دل نشین انداز میں اس حیات آفرین انقلاب کی تفصیل پیش کی جو قرآن نے انسانی زندگی میں پیدا کیا اور جس کی بدولت نوع انسانی اپنا کھویا ہوا مقام اور حقیقی آزادی از سر نو حاصل کرنے کے قابل ہو گئی۔

۱- فروری کی شب کو اسی مقام پر بزم کی طرف سے جشن نزول قرآن کی تقریب منانے کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر اراکین بزم کے علاوہ دیگر ممتاز حضرات بھی شریک محفل تھے۔ اجتماع گاہ کی زیبائش و آرائش۔ نور و نکہت کی داستان رواں۔ ارباب ذوق کا جوش و ولولہ، کام و دہن کی آزمائش کا سامان اور پیام اقبال کی صدائے فردوس گوش اپنی مثال آپ تھی۔ یہ جشن سابقہ جشن ہائے نزول قرآن سے کہیں سبقت لے گیا۔ خدا کا احسان ہے کہ تحریک اور اس کی جاذبیتوں کا حلقہ دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

لاہور چھاؤنی — چوہدری محمد اشرف صاحب کے مکان پر باقاعدگی سے بزم کے اجتماعات ہو رہے ہیں۔ گذشتہ ایک ماہ میں دو نئے ممبر بزم میں شامل ہوئے ہیں۔ قرآنی تحریک کو پھیلانے کے لئے گرد و نواح کے تعلیم یافتہ اشخاص سے رابطہ قائم کیا جا رہا ہے۔

ایلاء النبیؐ

(علامہ تمنا عمادی مدظلہ)

سورہ بقرہ میں ہے۔

لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ۔ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ۔ (۲/۲۲۵)

اللہ تمہاری بیہودہ قسموں پر مؤاخذہ نہیں کرتا بلکہ ان قسموں پر گرفت کرتا ہے جو تم دل کے ارادے سے کھاؤ۔ وہ غفور و حلیم ہے۔

یہاں ایک اصولی بات بیان ہوئی ہے۔ اس کے بعد ایک متعین حکم ہے اور وہ یہ کہ

لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِہِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَۃِ اَشْہُرٍ۔ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۲/۲۲۶)

جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھالیں تو انہیں چار ماہ تک انتظار کرنا چاہیئے۔ اگر وہ اس عرصہ میں باہمی تعلقات کی طرف رجوع کریں (تو اچھا ہے) اللہ غفور رحیم ہے۔

اگلی آیت میں ہے کہ اگر وہ تعلقات کیطرف رجوع نہ کریں اور طلاق کا فیصلہ کرلیں تو پھر .... (جیسا طلاق کا حکم ہے ویسا کریں)۔

اس سے ظاہر ہے کہ قسم یا تو لغو ہوتی ہے یا بالارادہ۔ بالارادہ قسم توڑنے پر کفارہ دینا پڑتا ہے جس کی بابت (پ ۱) میں حکم دیا گیا ہے۔ بلا ارادہ یعنی یونہی بیہودہ قسم پر قانونی گرفت نہیں ہوتی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جس کا جی چاہے یونہی بیہودہ قسمیں کھاتا رہے۔ جس عمل کو خدا نے لغو قرار دیا ہے اس کا ارتکاب سہواً یا اتفاقیہ ہو جائے

تو وہ بات ہے۔ لیکن اس کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ اس پر قانونی مؤاخذہ نہیں اس کا مرتکب ہوتے رہنا مومن کے شایانِ شان نہیں۔ اس لئے کہ لغو کی مذمت خود قرآن میں آئی ہے اور مومنین کا شیوہ یہ بتایا ہے کہ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ (۲۳/۳) وہ لغو باتوں سے اعراض برتتے ہیں۔ اور اگر اتفاقیہ ایسا ہو کہ انہیں کسی لغویات کے پاس سے گذرنا پڑے تو مَرُّوا كِرَامًا (۲۵/۷۲) وہ اپنا دامن بچاتے ہوئے نہایت شریفانہ انداز سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ مومن لغو کے پاس بھی نہیں پھٹکتا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اگر بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم (جسے اصطلاح میں ایلاء کہتے ہیں) بالارادہ کھائی گئی ہے اور بعد میں اسے توڑنا پڑا ہے تو اس سے ایک جرم کا ارتکاب عمل میں آتا ہے جس کا جرمانہ دینا پڑتا ہے۔ اور اگر وہ قسم یونہی بلا ارادہ (لغو) ہے تو وہ کوئی شریفانہ فعل نہیں۔ اس سے مومن احتراز کرتا ہے۔

لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ سورہ بقرہ کی آیت ایلاء (۲/۲۲۶) کی تفسیر میں ہماری کتب احادیث ہمیں بتاتی ہیں کہ نبی اکرمؐ نے اپنی ازواج مطہراتؓ کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی تھی اور اس طرح آپؐ ایک مہینہ بھر تک ان سے علیحدہ رہے تھے۔ آپ غور کیجئے کہ اس سے علاوہ اس کے کہ حضورؐ کے متعلق یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ آپ نے لغو یا بالارادہ قسم کھائی تھی، آپؐ کی گھریلو زندگی کے متعلق کس قسم کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ یعنی حضورؐ کے گھر کا ماحول ایسا تھا جس میں حضورؐ (اپنی ایک آدھ بیوی سے نہیں بلکہ) تمام ازواج مطہراتؓ سے ناراض ہو کر مہینہ بھر تک علیحدہ رہے اور اس تمام عرصہ میں نہ آپ نے معاملہ کو سدھارنے کی کوشش کی۔ اور نہ ہی ازواج مطہراتؓ نے حضورؐ کو منانے کے لئے کوئی اقدام کیا۔ یہ بیان احادیث کا ہے۔ قرآن کریم نے کہیں یہ نہیں کہا کہ حضورؐ نے ایلاء کیا تھا، حالانکہ قرآن (بالخصوص سورہ احزاب) میں حضورؐ کی اندرونِ خانہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات تک مذکور ہیں۔ لہٰذا جب ہم درایت (عقل و فکر اور دانش و بصیرت) کی رُو سے معاملہ کا جائزہ لیں گے تو یہ بات کسی تحقیق کی محتاج نہیں رہیگی کہ یہ روایات وضعی ہیں اور حضورؐ یا ازواج مطہراتؓ کے خلاف، وساوس پیدا کرنے (اور غیر مسلموں کے لئے حضورؐ کی سیرت طیبہ کے خلاف مواد بہم پہنچانے) کی خطرناک سازش کے طور پر وضع کی گئی تھیں۔ لیکن علامہ تمنا عمادی مدظلہ کا انداز اپنا ہے۔ وہ (درایت کے علاوہ) روایات کو فن رجال کی روشنی میں پرکھتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ روایات خود اپنے معیار کے مطابق بھی کس قدر ساقط الاعتبار ہیں۔ ذیل کے مضمون میں انہوں نے ایلاء سے متعلق روایات کو اسی طرح پرکھا ہے اور بتایا ہے کہ یہ کس قدر مکذوبات کا پلندہ ہیں۔ اور حضورؐ اور ازواج مطہراتؓ کا دامن کس طرح ان کی نسبت سے پاک ہے۔ وہ تمہید کے بعد مضمون کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔ جس طرح ذیل میں درج ہے۔ طلوع اسلام]

رابیلاءۃ النبی صلعم کے متعلق جتنی روایتیں ہیں وہ سب بہتان اور افترا ہیں - ہم صرف صحیح بخاری کی روایتیں پیش کر کے ان کی تنقید کر کے دکھاتے ہیں باقی کتابوں میں یہی حدیثیں ہیں جو اکثر انہی اسناد سے مروی ہیں ۔ اگر متن حدیث یا اسناد میں کہیں کہیں دوسری کتابوں میں کچھ فرق ہے تو وہ چنداں قابل توجہ نہیں ۔ جس کتاب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے اس کتاب کی حدیثوں کی حقیقت جب واضح ہو جائیگی تو اس سے اس سے پست تر کتابوں کی حدیثوں کا بھی اندازہ لگا لیا جا سکتا ہے ۔ اگر چہ بعد والوں نے بخاری کی بعض حدیثوں کی خامیوں کو محسوس کر کے ان خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے ۔ وہ بھی باوصف تامل معلوم ہو جا سکتا ہے

حدیث اول

صحیح بخاری کی پہلی حدیث جلد اول صفحہ ۵۵ (مطبوعہ مطبع احمدی) پر درج ہے ۔ یہ اس باب کی دوسری حدیث ہے اگرچہ اس حدیث کو باب سے کوئی تعلق نہیں ۔ بہرحال پوری حدیث معہ اسناد نقل کرنا باعث طوالت ہے اس حدیث میں ایک تو اس کا ذکر ہے کہ آپ گھوڑے سے گر گئے تھے ، اور آپ کی پنڈلی کچھ مجروح ہو گئی تھی ۔ اس وجہ سے آپ بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے ۔ اور آپ نے بیویوں سے ملنے کی ایک ماہ کے لئے قسم کھائی تھی اس لئے آپ ایک بلند جگہ کوٹھے پر ترکِ تعلق کر کے مقیم تھے ۔ صحابہؓ عیادت کے لئے جاتے تھے ۔ نماز کا وقت ہو گیا تو آپ نے نماز پڑھی صحابہؓ نے کھڑے ہو کر اقتدا کی ۔ آپ نے فرمایا کہ امام اس لئے ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے ۔ تو جب امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم لوگ بھی بیٹھ کر نماز پڑھو ۔ اور کھڑے ہو کر پڑھے تو تم لوگ بھی کھڑے ہو کر پڑھو ۔ اور ۲۹ دنوں کے بعد آپ اس کوٹھے سے اترا ئے صحابہؓ نے پوچھا کہ آپ نے ایک مہینہ کی قسم کھائی تھی ۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہ مہینہ ۲۹ دن کا ہے ۔

یہ حدیث امام بخاری کو محمد بن عبد الرحیم آل عمر کے آزاد کردہ فارسی الاصل غلام سے ملی ۔ جن کو محدثین ثقہ اور مامون لکھتے ہیں ۔ مگر فارسی الاصل آزاد کردہ غلام تھے ۔ اس کو یاد رکھئے ۔ ۱۸۵ھ میں پیدا ہوئے ۲۵۵ھ میں وفات پائی ۔

محمد بن عبد الرحیم روایت کرتے ہیں یزید بن ہارون سے یہ بھی ایک غلام آزاد کردہ تھے ۔ آخر میں بصارت جاتی رہی تھی یحییٰ ابن معین مشہور امام رجال کا قول ابن حجر تہذیب التہذیب میں نقل کرتے ہیں کہ یزید اصحاب حدیث میں سے نہ تھے ۔ وہ تمیز نہیں رکھتے تھے ۔ اور اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ کس سے روایت کر رہے ہیں ۔ مگر امام بخاری کے شیخ الشیوخ تھے اس لئے عام طور سے لوگ ان کو ثقہ ہی لکھتے ہیں ۔ آخر عمر میں روایتِ حدیث ترک کر دی تھی ۔ ۱۱۷ھ یا ۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ۲۰۶ھ میں وفات پائی ۔ بخاری الاصل تھے ۔ واسط میں رہے ۔ ان کی وفات کے وقت محمد بن عبد الرحیم ۲۱ برس کے تھے ۔ آخر عمر میں انہوں نے روایت حدیث ترک کر دی تھی تو ان کی روایت حدیث کے زمانے میں محمد بن عبد الرحیم چودہ پندرہ برس کے ہوں گے ۔ عبد الرحیم کو بغدادی لکھا ہے ۔ معلوم نہیں یہ کب تک غلام رہے اور کب آزاد ہوئے انہوں نے کب موقع پایا کہ یزید بن ہارون سے واسط جا کر حدیث سنتے ۔ مگر دونوں موالی ہی میں سے تھے ۔ یعنی آزاد کردہ غلام ہی تھے ۔

یزید بن ہارون اس حدیث کو حمید الطویل سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت انس سے ۔ امام شعبہ کہتے تھے کہ

حضرت انس سے حمید طویل نے صرف پانچ حدیثیں سنی تھیں۔ مگر بخاری ہی میں اس سے کہیں زیادہ حدیثیں یہ حضرت انس سے بلاواسطہ روایت کرتے ہیں۔ آخر یہ خود بھی ایک غلام آزاد کردہ ہی تھے بنی خزاعہ کے۔ اور مدلس بھی تھے۔ اور اکثر حدیثوں کو تدلیس کر کے حضرت انس ہی کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے۔ ابن حجر لکھتے ہیں دُبَّمَا دَ لَّسَ عَنْ اَنَسٍ۔ امام ذہبی میزان الاعتدال کتاب الضعفاء میں لکھتے ہیں کہ عقیلی اور ابن عدی نے ان کو ضعفاء میں شمار کیا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ امام بخاری اور حضرت انس کے درمیان تین راوی ہیں اور تینوں غلام آزاد کردہ۔ اور میرا دعویٰ یہی ہے کہ اس قسم کی ساری روایتیں عجمی غلاموں کی سازش کا نتیجہ ہیں۔

اس حدیث میں عام طور سے کل ازواج مطہرات سے ایلاء کرنے کا ذکر ہے۔ اب دوسری حدیث دیکھئے۔

حدیث دوم

اسی جلد کے صفحہ ۲۰۰ میں حمید طویل سے یہ حدیث مروی ہے جس کو امام عبد العزیز عبد اللہ الاولیسی سے روایت کرتے ہیں۔ امام بخاری کے شیخ ہیں اسلئے ائمہ رجال ان کو ثقہ لکھتے ہیں مگر امام ابوداؤد نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اور یہ روایت کرتے ہیں سلیمان بن بلال سے جو بربری غلام آزاد کردہ تھے۔ عثمان بن ابی شیبہ نے ان کے متعلق کہا کہ لا باس بہ ولیس ممن یعتمد علی حدیثہ۔ ان میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر یہ ان لوگوں میں نہیں ہیں جن کی حدیث پہ اعتبار کیا جائے۔ اور یہی سلیمان بن بلال جو ایک آزاد کردہ غلام تھے حمید طویل سے اس حدیث کی روایت کرتے ہیں اور ان کے آزاد کردہ غلام ہونے کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

تیسری حدیث

پھر اسی صفحے میں اس سے پہلے حضرت ام سلمہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب کر کے ایک حدیث روایت کی گئی ہے جس کو امام بخاری ابو عاصم ضحاک بن مخلد سے روایت کرتے ہیں جو بنی شیبان کے غلام آزاد کردہ تھے۔ ۲۱۲ھ کے آخر میں وفات پائی۔ بصری تھے۔ امام بخاری ان کی وفات کے وقت اٹھائیس برس کے تھے کیونکہ امام کی پیدائش ۱۹۴ھ کی ہے۔ امام بخاری نے کب ان سے یہ حدیث سنی اللہ ہی جانتا ہے؟

مگر اصل راوی اس حدیث کے درحقیقت ابن جریج ہیں جو بنی امیہ کے غلام آزاد کردہ تھے۔ رومی الاصل تھے۔ ان کو ائمہ رجال نے حاطب اللیل لکھا ہے۔ یعنی ہر رطب یابس کو اکٹھا کر لینے والے تھے۔ زہری کی حدیثوں میں ان کو لیس بشیٔ لکھا ہے اور ریح کے مثابہ ان حدیثوں کو بتایا ہے۔ منکر حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔ اور بہت سخت مدلس تھے۔ امام دارقطنی کہتے تھے کہ ابن جریج کی تدلیس سے بچو یہ کسی مجروح ہی راوی کی حدیث میں تدلیس کرتے تھے۔ یعنی اس مجروح راوی کے نام کی جگہ کسی ثقہ راوی کا نام رکھ دیا کرتے تھے۔ اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ ابن جریج نے ستر عورتوں سے متعہ کیا تھا۔ پھر آخر یہ بھی موالی ہی میں سے تھے۔ اور جن سے ابن جریج اس حدیث کو روایت کرتے ہیں یعنی یحییٰ بن عبد اللہ بن محمد الصیفی وہ انہیں کی طرح موالی میں سے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے آزاد کردہ غلام تھے۔

چوتھی حدیث اور صفحہ ۲۴ سے صفحہ ۲۵ تک ایک لمبی چوڑی حدیث ہے جس کو ابن شہاب زہری روایت کرتے ہیں عبید اللہ بن عبداللہ بن ابی ثور سے جو نوفل کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اور وہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ابن حجر تہذیب التہذیب صفحہ ۔ تا صفحہ ۱۲ میں ان کے ترجمے میں لکھتے ہیں ذکر الخطیب فی المکمل انہ لم یرو عن غیر ابن عباس ولم یرو عنہ غیر الزہری یعنی علامہ خطیب بغدادی نے اپنی کتاب المکمل میں ذکر کیا ہے کہ عبید اللہ بن عبداللہ ابن عباس کے سوا اور کسی سے روایت نہیں کرتے۔ اور ان عبید اللہ بن عبداللہ بن ابی الثور سے زہری کے سوا کوئی دوسرا روایت نہیں کرتا۔ آخر یہ کیوں؟ یہ ابن ابی الثور مدنی تھے۔ قریش کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اس لئے قریشی کہے جاتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ کے سوا اور کوئی اس قابل ان کے نزدیک نہ تھا جس سے یہ حدیثیں سنتے اور روایت کرتے؟ اور پھر زہری کے سوا ان کو کوئی دوسرا ملا جس سے روایت کرتے، اور وہ ان سے حدیثیں لے کر زہری کی طرح روایت کرتا! بات یہ ہے کہ زہری حاطب اللیل تھے۔ ہر کس و ناکس سے حدیثیں پوچھ پوچھ کر لیا کرتے تھے۔ اور پھر یہ تو درحقیقت خود بھی موالی ہی میں سے بنی زہرہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ یہ خود نہ ہی ان کے والد یا دادا ہی سہی۔ مگر نسب نامے کی ایک کتاب تیار کر رکھی تھی اور اپنے کو بنی زہرہ ہی سے کہا کرتے تھے۔ لوگوں نے ان کو جھٹلانے میں کوئی فائدہ محسوس نہ کیا اس لئے ان کے بیان کو تسلیم کر لیا۔ مگر ہم نے جو ان کے نسب نامے پر تذکرہ جاہل شہاب زہریؒ میں اعتراضات کئے ہیں ان میں سے کسی کا بھی کوئی جواب کسی سے نہ ہو سکا۔

اور پھر یہ تو ان سازشیوں کے مقرر کئے ہوئے ایجنٹ ہی تھے۔ اور سازش میں موالی ہی پیش پیش تھے۔ غلاموں ہی کی ان میں اکثریت تھی۔ بعض سیدھے سادے مسلمان بھی ان کے دام فریب میں آ گئے ہوں گے۔ مگر آپ دیکھیں گے تو ایسا رسول اللہ صلعم کی ساری حدیثیں موالی ہی سے مروی ہیں جن میں سے متعدد تو ابن جریج ہی سے مروی ہیں۔ یہ حدیث جلد دوم میں صفحہ ۔ سے صفحہ ۱۸۱ تک اپنی طوالت کے ساتھ موجود ہے۔ یہاں زہری سے عقیل بن خالد روایت کرتے ہیں جو حضرت عثمانؓ کے غلام آزاد کردہ تھے۔ ایلہ کے ساکن زہری کے ہموطن تھے۔ اور دوسری جگہ صفحہ ۔ میں زہری سے شعیب بن ابی حمزہ روایت کر رہے ہیں۔ یہ بھی بنی امیہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اور زہری کے خاص کاتب تھے۔ اسی لئے زہری کی حدیثوں میں دوسروں سے زیادہ قابل وثوق سمجھے جاتے ہیں۔ بہرحال تھے یہ بھی ایک آزاد کردہ غلام۔

اب اس حدیث کا پورا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

حدیث پنجم (ترجمہ) (امام بخاری فرماتے ہیں کہ) ہم سے حدیث بیان کی یحییٰ بن بکیر نے۔ ان سے لیث بن سعد نے ان سے عقیل نے ان سے ابن شہاب زہری نے کہ مجھکو خبر دی عبید اللہ بن عبداللہ بن ابی ثور نے عبداللہ بن عباس سے روایت کر کے کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھکو بڑی حرص تھی اس بات کی کہ حضرت عمرؓ سے ان دو عورتوں کے بارے میں پوچھوں کہ وہ دو عورتیں کون تھیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنْ تَتُوْبَا اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (۶۶ : ۴) تو میں نے ان کے ساتھ حج کیا۔

تو وہ راستے سے کترائے (استنجا وغیرہ کے لئے) تو میں بھی ان کے لئے پانی کا ظرف لیکر کترایا۔ وہ فارغ ہوکر واپس آئے تو میں نے اُن کے ہاتھوں پر اُسی ظرف سے پانی ڈالا تو انہوں نے وضو کیا۔ پھر میں نے کہا کہ اے امیرالمومنینؓ ازواج رسولؐ میں سے وہ کون دو عورتیں ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے اِنْ تَتُوْبَا ...... تو انہوں نے فرمایا کہ سخت تعجب ہے اے ابن عباسؓ! (یعنی تمہاری اس ناواقفیت پر) وہ عائشہؓ اور حفصہؓ ہیں۔ پھر حضرت عمرؓ متوجہ ہوکر حدیث بیان کرنے لگے۔ اور فرمایا میں تھا اور میرا ایک پڑوسی تھا بنی امیہ بن زید میں سے اور اس کا محلہ عوالی مدینہ میں واقع تھا۔

دونوں باری باری نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضری دیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ حاضر رہتا تھا اور ایک دن میں۔ جو باہر سے آتا حاضر باش سے اس دن کی اتری ہوئی آیتیں اور باتیں جو حضور فرماتے تھے یا جو کوئی واقعہ ہوتا تھا پوچھ لیا کرتا تھا۔ ہم دونوں کا یہی معمول تھا۔ اور ہم قریش کے لوگ ہمیشہ عورتوں پر چیرہ دست رہا کرتے تھے۔ مگر انصار کے پاس آئے تو ہم نے دیکھا کہ ان کی عورتیں ان پر چیرہ دست رہا کرتی ہیں تو ہماری عورتوں نے بھی انصاری عورتوں کے دیکھا دیکھی وہی عادت اختیار کرلی۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں اپنی بیوی پر گرجا، تو اُس نے بھی اسی طرح جواب دیا، جو مجھکو ناگوار گذرا بیوی نے کہا کہ میرا جواب تم کو ناگوار کیوں ہوا؟ قسم اللہ کی نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویاں بھی آپ کو اسی طرح جواب دے دیا کرتی ہیں، اور کوئی ان میں سے (جس سے کچھ آن بن ہوئی وہ) دن دن بھر آپ سے بول چال چھوڑ دیتی ہے رات تک اس (خبر) نے مجھکو پریشان کردیا۔ میں نے کہا کہ (ان میں سے) جس نے ایسا کیا ہے وہ سخت خسارے میں ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے کپڑے پہنے اور حفصہؓ کے پاس پہنچا۔ اور اس سے کہا کہ اے حفصہؓ! کیا تم میں سے کوئی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے خفگی کرکے ان کو (رات آنے سے) خفا کر دیتی ہے؟ تو حفصہؓ نے کہا کہ ہاں۔ تو میں نے کہا کہ وہ گھاٹے اور بدنصیبی میں ہے۔ کیا وہ اس سے نہیں ڈرتی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خفا کرکے وہ اللہ کی خفگی میں پڑجائیگی۔ اور پھر وہ ہلاک ہی ہوکر رہیگی۔ دیکھو۔ تم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے منہ لگ کے نہ بولنا اور نہ ان کی باتوں کا الٹ کر جواب دینا (ذرا برابر بھی)، اور نہ ان سے بول چال ترک کرنا، اور تم کو جس چیز کی ضرورت ہو مجھ سے مانگ لینا، اور اس بھروسے پر نہ رہنا کہ تمہاری پڑوسن جو ہے وہ تم سے زیادہ حسین ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی محبوبہ ہے۔ ان کی مراد (حضرت) عائشہؓ سے تھی۔

اور ہم لوگ (ان دنوں) باہم تذکرہ کرتے تھے (افواہی خبروں کو سُن سُن کر) کہ (شاہ یمن) غسّان مدینے پر حملے کی تیاری کررہا ہے۔ تو وہ انصاری دربارگاہ نبوی میں اپنی باری کے دن گئے۔ اور رات کو واپس آئے تو میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ زور زور سے پیٹا۔ اور میرا نام لے کر کہا کہ وہ سوئے ہیں؟ تو میں پریشان ہوا۔ پھر (باہر) نکلا۔ انہوں نے کہا کہ ایک بڑا حادثہ پیش آگیا۔ میں نے کہا کہ وہ کیا؟ کیا غسّان آگیا؟ انہوں نے کہا کہ نہیں بلکہ اس سے بھی بھاری بات ہوگئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی (حضرت عمرؓ نے) کہا کہ پھر سے گھاٹے میں رہی حفصہؓ اور

نامراد رہی۔ میں سمجھتا تھا کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ تو میں نے اپنے کپڑے درست کئے اور صبح کی نماز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھی۔ اس کے بعد آپ اپنے حجرہ کے پر چلے گئے۔ اور تنہائی اختیار کر لی۔ تو میں حفصہؓ کے پاس چلا گیا۔ وہ رونے لگی۔ میں نے کہا کیوں روتی ہو؟ کیا میں اس دن سے تمہیں ڈراتا نہ تھا؟ کیا تم لوگوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے طلاق دیدی؟ انہوں نے کہا میں نہیں جانتی۔ وہ اسی حجرہ کے میں ہیں۔ تو میں حفصہؓ کے یہاں سے چلا آیا اور میں (مسجد نبوی میں) ممبر کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ ممبر کے گرد ایک جماعت ہے (مغموم) ان میں سے بعضے رو رہے تھے تو میں کچھ دیر اُن کے پاس بیٹھا۔ تو جو پریشانی مجھ کو تھی وہ مجھ پر غالب آئی تو میں حجرہ کے میں آنحضرت تھے میں اس کے پاس پہنچا اور آپ کے ایک حبشی غلام سے کہا کہ عمر کے لئے اجازت حاصل کرو۔ تو وہ حجرہ کے میں گیا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے باتیں کیں۔ پھر نکلا۔ اور کہا کہ میں نے تمہارا ذکر کیا مگر آپ چپ رہے۔ تو میں وہاں سے چلا آیا اور ان لوگوں کے پاس جو ممبر کے پاس بیٹھے تھے بیٹھ گیا اور پھر میری پریشانی مجھ پر غالب ہوئی۔ پھر میں حجرہ کے کے پاس آیا اور غلام سے کہا۔ پھر اس نے واپس آکر پہلی ہی طرح خبر سنائی۔ پھر میں ممبر کے پاس والوں میں آکر بیٹھ گیا (کچھ دیر کے بعد) پھر پریشانی زیادہ محسوس کی تو پھر اٹھا اور غلام سے جاکر اجازت کے لئے کہا۔ پھر اس نے وہی پہلا سا جواب آکر دیا۔ تو جب میں واپس پھرنے لگا تو غلام نے مجھ کو پکارا اور کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ نے حاضری کی اجازت تمہیں دیدی۔ تو میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر ہوا۔ تو میں نے آپ کو بنی ہوئی چٹائی پر لیٹا ہوا پایا۔ آپ کے جسم (مبارک) اور اس چٹائی کے درمیان کوئی بچھونا نہ تھا۔ آپ کے پہلو پر چٹائی کی بناوٹ کے نشان پڑ گئے تھے اور چھوارے کی چھال بھرا چمڑے کا ایک تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ پھر کہا کھڑے ہی کھڑے کہ کیا حضور نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی؟ تو آپ نے اپنی نظر میری طرف اٹھائی اور فرمایا۔ نہیں۔ پھر کھڑے ہی کھڑے میں نے عرض کیا کچھ کھل کر باتیں کیجئے یا رسول اللہ! آپ دیکھیں ہم لوگ خاندان قریش سے ہیں۔ عورتوں پر چرب رہا کرتے تھے اور ایسی قوم میں آپڑے جن یہاں کی عورتیں چرب رہتی ہیں۔ تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم مسکرائے۔ پھر میں نے کہا کہ دیکھئے میں حفصہؓ کے پاس گیا تو میں نے اس سے کہا کہ تم اس بہتے پر قبھول رہو کہ تمہاری پڑوسن وہ ہے جو تم سے زیادہ حسین ہے اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی محبوبہ ہے۔ ان کی مراد عائشہؓ ہیں۔ تو پھر (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) دوبارہ مسکرائے۔ تو آپ کو مسکراتا دیکھ کر میں بیٹھ گیا۔ پھر میں نے آپ کے اس گھر کی طرف نظر دوڑائی تو قسم اللہ کی ایسی کوئی چیز نہیں پائی جس کی طرف نظر دوبارہ پھر جاتے (یعنی اس کو پھر دیکھنے کو جی چاہے) اللہ کی قسم میں نے تین کچی کھالوں کے سوا کچھ نہ پایا۔ تو میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالےٰ سے دعا فرمائیے کہ آپ کی امت کو وسعت رزق عطا فرمائے۔ فارس اور روم کو اتنی وسعت ملی ہے اور دنیا کا سامان ہر طرح کا انہیں دیا گیا ہے۔ باوجودیکہ وہ اللہ کی عبادت نہیں کرتے۔ اور آپ تکیہ لگائے تھے۔ فرمانے لگے کیا اے (عمر) ابن خطاب! تم کسی شک میں (مبتلا ہو گئے) ہو؟ یہ لوگ ایسی قوم ہیں جن کے لئے (دنیا کی نیکیوں کی جزا اسی دنیا میں) جلد دے دی

گئی ہے اس دنیا ہی زندگی ہیں۔ تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے لئے مغفرت طلب فرمایئے۔ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کی وجہ سے کنارہ کشی اختیار فرمائی جب کہ حفصہ نے اس کو عائشہ پر ظاہر کر دیا۔ اور آپ نے فرمایا تھا کہ میں ان سب کے پاس ایک مہینے تک نہ جاؤں گا۔ اپنے سخت غصے کی وجہ سے جو مجھے ان پر تھا۔ جبکہ اللہ نے آپ پر عتاب کیا تھا، تو جب انتیس[29] دن گذر گئے۔ تو آپ (حضرت) عائشہ کے پاس تشریف لائے۔ اور انہی سے شروع فرمایا (حضرت) عائشہ نے عرض کیا کہ آپ نے قسم کھائی تھی کہ تم لوگوں کے پاس ایک مہینے تک نہیں آئیں گے۔ اور ہم لوگوں نے انتیس ہی راتیں گذاری ہیں۔ ہم اس کو برابر گن رہے ہیں۔ تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ مہینہ انتیس[29] کا ہے۔ اور وہ مہینہ (واقعی) انتیس[29] کا تھا اور عائشہ[2] نے کہا کہ تخییر کی آیت اتری تو پہلے پہل مجھی سے شروع فرمایا۔ فرمایا کہ میں تم کو ایک بات کی نصیحت کرنے آیا ہوں تم جلدی (جواب دینے میں) نہ کرو تو تم پر کوئی الزام نہیں ہے۔ یہاں تک کہ تم اپنے والدین سے بھی اسکو پوچھ لو۔ انہوں نے عرض کیا کہ یہ معلوم ہے کہ میرے والدین آپ سے علیحدگی کا کبھی مشورہ نہ دیں گے پھر کہا (آپ نے) کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ اے نبی! اپنی بیبیوں سے کہہ دو قل لا زواجک سے عظیما ۰ تک۔ تو (حضرت) عائشہ نے کہا کہ کیا اس کے لئے میں اپنے والدین سے پوچھوں گی؟ میں اللہ و رسول اور دار الآخرۃ ہی کی طالب ہوں۔ پھر آپ نے (اسی طرح) اختیار دیا اپنی ہر بیوی کو اور سب نے ویسا ہی جواب دیا جیسا حضرت عائشہ نے دیا تھا۔

تنقید متن حدیث

اس طویل و عریض فسانے کو دیکھیئے۔ اس کے الفاظ پر غور کیجئے اور اس حدیث کے بنانے والے کی ذہنیت کے ساتھ ساتھ اس کی ذہانت اور پیش بندیوں کی داد دیجئے۔ مگر میں نے اکثر حدیثوں کی تنقید میں اس کو لکھا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جہاں قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحٰفظون فرما کر وہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ وعدہ فرمایا ہے کہ واللہ یعصمک من الناس۔ یحفظک نہیں فرمایا ہے بلکہ یعصمک فرمایا ہے حفاظت اور عصمت کے مفہوم سے فرق کو سمجھنا چاہیئے۔ حفاظت مادی ہوتی ہے جسم کی۔ زندگی کی۔ مال کی۔ اسباب کی حفاظت کو عموماً عصمت نہیں کہہ سکتے عصمت کا تعلق مادی وغیرہ مادی سب چیزوں سے ہے۔ اسی لئے عصمت کا تعلق اخلاق سے بھی ہوتا ہے فرشتے معصوم ہیں۔ شیر خوار بچے معصوم ہیں یعنی ان سے کوئی اخلاقی خرابی سرزد نہیں ہو سکتی۔ یہ گناہوں سے بچے ہوئے ہیں۔ اگرچہ عصمت بمعنی حفاظت بھی بہت مستعمل ہے مگر حفاظت بمعنی عصمت یعنی روحانی و اخلاقی حفاظت شاذ و نادر ہی مستعمل ہے۔ اس لئے عصمت کا لفظ عام ہے جسمانی و اخلاقی ہر طرح کی حفاظت کے مفہوم کو شامل ہے جیسے پسر نوح نے کہا تھا پہاڑ کے متعلق کہ یعصمنی من الماء جس پر حضرت نوح نے فرمایا لا عاصم الیوم من امر اللہ الا من رحم۔ یہاں عاصم بمعنی معصوم آیا ہے کیونکہ الہامت رحم

کا استثنا معصومین میں سے ہے یعنی عاصم یہاں محفوظ کے معنی میں ہے۔ بغرض عصمت۔ تو واللہ یعصمک من الناس میں جہاں آپ سے آپ کی جسمانی و جانی حفاظت کا وعدہ فرمایا گیا ہے وہاں آپ کی اخلاقی حفاظت کا وعدہ بھی اس میں داخل ہے کسی طرح کی بداخلاقی کوئی ایسی بات جو شان نبوت کے خلاف ہو آپ سے کبھی سرزد نہیں ہوسکتی اور نہ کوئی آپ کی طرف کسی بداخلاقی کو منسوب کرکے آپ کی بدنامی مشہور کرسکتا ہے۔ جس طرح قرآن مجید پر طرح طرح کے متعدد محاذ قائم کرکے لوگ صدیوں تک کرتے رہے اور آجتک بعض تو دشمن ہیں بعض نادان دوست بن کر رہے ہیں اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی ایسی ایسی باتیں جو پست اخلاقی بلکہ بداخلاقی کی کہی جاسکتی ہیں منافقین عجم نے حدیثیں گھڑ گھڑ کر روایت کیں اور ہمارے روایت پرست محدثین نے ان کو اپنی کتابوں میں درج کردیا یا ان کی کتابوں میں انہیں منافقین نے داخل کرکر کے ان کتابوں کی نقلیں کرکر کے شائع کیں اور ان کی من گھڑت حدیثیں آجتک ان کی کتابوں میں انہیں جامعین احادیث کی طرف منسوب ہوکر ہمارے علماء کے نزدیک قرآن مجید کے ساتھ مثلہ معہ بنی ہوئی ہیں۔

مگر جس طرح قرآن مجید کے متعلق جتنی روایتیں اختلاف قراءت کی یا جھوٹی شان نزول کی یا جھوٹی تفسیر کی مروی ہیں ان میں یا تو راوی ہی کا وضاع و کذاب ہونا ان روایات کو جھٹلانے کے لئے کافی ہوگا یا متن روایات میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہوگی جو اس حدیث کے موضوع ہونے کی واضح دلیل ہوگی۔ اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف جتنی جھوٹی حدیثیں منسوب ہیں خصوصاً ایسی جو قرآن مجید کی کسی آیت کے خلاف ہو یا ایسی حدیث ہو جس سے آپ کے اخلاق پر حرف آتا ہو۔ شان نبوت کے خلاف ہو یا تو اس حدیث کا راوی وضاع و کذاب ہوگا یا جھوٹے اسناد ثقہ راویوں کے ساتھ جوڑ کر کسی منافق نے کسی محدث کی کتاب میں داخل کردی ہے تو متن حدیث میں ضرور کوئی نہ کوئی ایسی واضح بات اس حدیث میں ہوگی جس سے اس حدیث کا کذب و افترا واضح ہوجائے گا۔ اس حدیث کے راوی تو . . . . ابن شہاب زہری ہی ہیں دوسرے طاق کا ذکر آگے آتا ہے۔

مگر متن حدیث کی کمزوریوں کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اور اس حدیث کے گھڑنے والے نے کہاں کہاں لکڑی ماری ہے۔ اس پر غور کیجئے۔ نمبروار لکھتا ہوں۔

۱؎ اس وضاع نے حضرت فاروق اعظمؓ کے متعلق یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ بارگاہ نبوت میں روزانہ کے حاضر باش نہ تھے۔ ایک دن درمیان دے کر حاضر رہتے تھے۔ اس لئے صحبت نبوی سے اس قدر مستفیض نہیں ہوئے جس قدر کہ روزانہ کے حاضر باش لوگ مستفیض ہوتے تھے چنانچہ اسی من گھڑت حدیث کا سہارا لے کر ایک دوسرے منافق نے یہ حدیث گھڑی ہے کہ ایک آیت کو حضرت عبداللہ بن مسعود کسی دوسرے طریقے سے پڑھتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ٹوکا تو انہوں نے ڈانٹ کر کہا کہ تم تو اپنے بازار کے سودا سلف میں رہا کرتے تھے اور ہم ہر دم کے حاضر باش تھے یہ آیت ہمارے سامنے یوں ہی اتری تھی۔ تو حضرت عمرؓ چپ ہو رہے۔ دیکھئے اتقان یا میری کتاب جمع قرآن مجید

کیا ہے کہ یہ حدیث اور وہ دونوں ایک ہی شخص کی من گھڑت ہو۔

نمبر۲ حضرت عمرؓ نے اپنے اس پڑوسی کا اس قدر پتا بتایا کہ وہ انصاری تھا بنی امیہ بن زید کے قبیلے کا تھا۔ عوالی مدینہ میں اس کا مکان تھا۔ مگر اس کا نام نہیں بتایا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس تو تقریباً ہر انصاری صحابی سے واقف تھے صرف نام بتا دینا کافی تھا۔ ان تین تین باتوں کے ذریعے تعارف ناقص کرانے کا فائدہ کیا تھا جبکہ ان تین باتوں کے جاننے کے بعد بھی حضرت ابن عباس ہرگز نہ سمجھ سکے ہونگے کہ وہ کون شخص تھا۔ مگر حدیث گھڑنے والا کسی کا نام لینے سے ڈرا کہ شاید ان صحابی کی کوئی اولاد موجود ہو بیٹا یا پوتا اور وہ اس کے بیان کو جھٹلا دے۔ اس لئے کہ یہ روایتیں تو پہلی صدی کے اواخر میں گھڑی گئیں یا اوائل ہی میں۔ اس لئے اس وقت کتنے صحابی کے بیٹے اور پوتے زندہ موجود ہونگے اس لئے اس کتاب نے حضرت عمرؓ کے اس پڑوسی نام نہیں بتایا۔

نمبر۳ اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس غلام کا نام نہیں بتایا۔ غلام کا لفظ عربی میں اس معنی میں مستعمل نہیں تھا اور نہ ہے جس میں عام طور سے فارسی اور اردو میں مستعمل ہے۔ عربی میں غلام کے معنی چھوکرا۔ لڑکا۔ بولتے ہیں۔ "اسود" کا لفظ حبشی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اور "اسود" لوگوں کا نام بھی اہل عرب میں تھا بلکہ خاندانی قریش میں بھی بعض کا نام اسود تھا۔ اس لئے "اسود" کے لفظ سے حبشی بھی سمجھ سکتے ہیں اور اس لڑکے کا نام "اسود" بھی سمجھ سکتے ہیں۔ جب شخصیت متعین نہ ہو تو یہاں بھی وہی سہولت حاصل کر لی گئی۔ اگر اس لڑکے کا نام واضح طور سے بتا دیا جاتا تو وہ جب اس وقت لڑکا تھے تو پہلی صدی کے اواخر بلکہ دوسری صدی کے اوائل میں ان کی بلا واسطہ اولاد زندہ ہو سکتی ہے اور وہ دور اولاد تو یقیناً۔ یہاں بھی جھٹلائے جانے کے ڈر سے اس غلام کا نام نہیں بتایا۔

نمبر۴ حضرت عمرؓ جب دروازے پر اجازت پاکر پہنچے تو انہوں نے سلام کیا اور گفتگو شروع کر دی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا یا نہیں اس کا ذکر ہی نہیں۔ یہ بالقصد حدیث بنانے والے نے چھوڑ دیا یا سہواً دونوں کا امکان ہے۔ قصداً چھوڑا ہو تو یہ مقصود ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا نہایت رنج اور نہایت غصہ ثابت کیا جائے کہ ان کے سلام کا جواب تک نہ دیا۔

اور یہ بھی ثابت ہو کہ حضرت عمرؓ کو بارگاہ نبوت میں کوئی تقرب خاص حاصل نہ تھا اس لئے ان کے سلام کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

اور پھر یہ پہلو بھی ہے کہ راوی نے اس کے ذکر کی ضرورت نہ سمجھی کہ حضورؐ نے ان کے سلام کا جواب دیا اس لئے کہ سلام کا جواب دینا ضروری ہے تو یقیناً دیا ہی ہوگا اس کے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس لئے جواب سلام کا ذکر راوی نے قصداً چھوڑ دیا۔ حالانکہ راوی حدیث کا یہ حق نہیں کہ بعض بات کو بیان کرے اور بعض کو نہ بیان کرے کہ سننے والا اندازہ سے خود ہی سمجھ لیگا۔ اگر کہا جائے کہ راوی کا قصور نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ ہی نے جواب سلام کا ذکر نہیں کیا یہ سمجھ کر کہ ابن عباس

ضرور سمجھ لیں گے کہ جواب سلام ضرور دیا ہوگا۔ تو اس کا بھی تردید نہیں کیونکہ حضرت عمرؓ بقول راوی جس تفصیل سے بیان کر رہے ہیں جس میں بے سود اپنے پڑوسی کا نہیں مگر اس کے قبیلے کا نام اور اس کے گھر کا پتا بھی بتا رہے ہیں جس سے سننے والے کو کوئی فائدہ نہ ہو تو یہ ایک واقعہ جو ہوا تھا اس کو درمیان سے کیوں چھوڑ دیں گے۔ خصوصاً جب حضورؐ کے نہایت غیظ وغضب کی حالت کا ذکر کیا جا رہا ہے اور بمشکل حضرت عمرؓ کو حاضری کی اجازت ملی ہے ایسے وقت میں صرف حضرت عمرؓ کے سلام کا ذکر اور آنحضرت کے جواب سلام کا مطلق ذکر نہیں یہ ظاہر کر سکتا ہے کہ غیظ وغضب کی وجہ سے آپ نے جواب نہ دیا ہو یہ بھی کہنا صحیح نہیں ہے کہ جب قرآن میں حکم صریح اسلام کے جواب دینے کا موجود ہے تو یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت نے حضرت عمرؓ کو جواب سلام نہ دیا ہوگا اس لئے کہ قرآن مجید میں زن وشو کے درمیان نشوز ہو تو باہمی اصلاح کا طریقہ بتا دیا ہے فابعثوا حکما من اھلہ و حکما من اھلھا۔ ایک مہینے کے لئے قسم کھا کر بیوی سے علیحدگی اختیار کرنے کا طریقہ قرآن میں نہیں بتایا گیا ہے۔ جب نعوذ باللہ رسول صلے اللہ علیہ وسلم ایک حکم خداوندی کے خلاف عمل کر سکتے تھے تو دوسرے حکم کو بھی ٹال سکتے تھے

ھے حضرت حفصہ کو پہلے پہل حضرت عمرؓ نے سمجھاتے ہوئے جو فرمایا تھا کہ لا یغرنک ان کانت جارتک ھی اوضأ منک و احب الی رسول اللہ صلے اللہ وسلم " اس کے بعد " یرید عائشۃ راوی کی طرف سے اضافہ ہی ہو سکتا ہے حضرت عمرؓ کا قول نہیں ہو سکتا۔ اگر حضرت خود عمرؓ فرماتے تو اسے یرید عائشۃ فرماتے۔ اور ان کو اس کے کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے کہ اتنے ہی جملے سے حضرت حفصہ سمجھ سکتی تھیں تشریح کی ضرورت نہ تھی۔ راوی کو حضرت عمرؓ کے قول میں اضافے کا کیا حق تھا چاہے وہ راوی بقول وضاع حضرت ابن عباسؓ ہی کیوں نہ ہوں۔

پھر جب حضرت عمرؓ نے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کو دہرایا ہے کہ میں حفصہؓ کے پاس گیا تھا اور حفصہ سے اس طرح کہا وہاں بھی اتنی عبارت دہرانے کے بعد پھر " یرید عائشۃ " کا لفظ بھی دہرایا گیا ہے۔ اور پھر یہاں بھی یہ فقرہ راوی کی طرف سے اضافہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ اگر یہاں بھی کہتے تو یہ بھی نہ کہتے۔ اسے یہی کہتے۔ مگر اس کے بھی کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ حضرت حفصہؓ و حضرت عائشہؓ کو مطعون کرنے کا جذبہ ان منافقین کے ناپاک دلوں میں تھا اسی جذبے نے ان کو مجبور کیا کہ وہ بے ضرورت بھی حضرت عائشہؓ کا نام روایت میں ٹھونس دیں

پھر دونوں جگہ اس کا بھی اظہار مقصود ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ دوسری بیبیوں سے زیادہ محبوب تھیں صرف اپنے حسن وجمال کے باعث۔ حسن وجمال کے سوا یا کنواری ہونے کے سوا یا کمسن ہونے کے سوا اور کوئی وجہ ان کے محبوب ہونے کی نہ تھی۔ نعوذ باللہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی ان راویان حدیث کے نزدیک (معاذ اللہ) محض حسن پرست تھے۔ حضرت عائشہ کو کوئی اور خصوصیت دوسری ازواج کے مقابلے میں ان کے نزدیک

حاصل نہ تھی۔ حضرت عائشہ کی خصوصیتوں کی تفصیل ہم اپنے مضمون میں جو حضرت عائشہ کے تذکرے میں ہے کرچکے ہیں رسالہ خاتون پاکستان کراچی بابت ماہ ۱۹۶۲ء میں جو میرا مضمون حضرت عائشہ کے متعلق چھپا ہے اس میں بھی تفصیل مذکور ہے یہاں پر اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

۵۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں فجلست حین رأیتہ یتبسم جب میں نے دیکھا کہ آپ نے تبسم فرمایا دوسری بار بھی تو میں جو کھڑے کھڑے بات کر رہا تھا بیٹھ گیا۔ یعنی بلا اجازت بیٹھ گئے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لڑکے کو بھیج کر جب حضرت عمرؓ کو بلوایا جبکہ وہ اجازت سے مایوس ہو کر واپس جا رہے تھے۔ تو اب جب حضرت عمرؓ آتے تھے تو اخلاق نبوی کا تقاضا یہی ہو سکتا ہے کہ آپ بیٹھے نہ ہیں اٹھ کے بیٹھ جائیں اور ان کو بھی بیٹھنے کے لئے کہیں۔ نہ یہ کہ آپ خود لیٹے رہیں جس طرح لیٹے تھے اور وہ کھڑے کھڑے باتیں کریں اور پھر بلا اجازت خود سے بیٹھ جائیں؟ یہ اخلاق نبوی سے بالکل بعید ہے۔

درحقیقت حدیث گھڑنے والے نے یہ اس لئے بیان کیا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نظر میں حضرت عمرؓ کی کوئی وقعت نہ تھی۔ اسی لئے وہ آئے، سامنے کھڑے کھڑے کچھ عرض کرتے رہے۔ مگر رسول اللہ صلعم اپنی چٹائی پر لیٹے ان کو دیکھتے رہے اور ان کی باتیں سنتے رہے۔ ان کو بیٹھنے تک کو نہ کہا۔ اور حضرت عمرؓ کی بے تمیزی ثابت کی کہ بلا اجازت بیٹھ گئے۔ یہ بھی مذکور نہیں کہ اس چٹائی پر یا زمین پر۔

۶۔ خاتمہ داستان میں حضرت عمرؓ کا قول بتایا گیا ہے۔ فاعتزل النبی صلے اللہ علیہ وسلم من اجل ذالک الحدیث حین افشتہ حفصہ الی عائشۃ۔ اللہ ہی جانے کہ اس جملے کا کیا مطلب ہے۔ من اجل ذالک الحدیث سے کونسی "حدیث" مراد ہے؟ کیا یہی جس کو ابن شہاب اپنے شیوخ کے ذریعے حضرت ابن عباس سے روایت کر رہے ہیں؟

۷۔ اس بے معنی جملے سے ثابت ہو رہا ہے کہ قصور حضرت حفصہؓ کا تھا۔ حضرت عائشہؓ کا کیا قصور تھا؟ ہاں اگر روایت میں یہ بھی ہوتا کہ حضرت عائشہ کو یہ خبر مل گئی تھی کہ حفصہ سے کوئی راز کی بات کہی گئی ہے اور وہ باصرار حضرت حفصہ سے پوچھتیں اور وہ ان کے اصرار سے مجبور ہو کر کہہ دیتیں تو البتہ دونوں مجرم ہوتیں۔ یا یہی مذکور ہوتا کہ حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ سے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ مجھ سے ایک راز کی بات کہی گئی ہے۔ اس کے بعد حضرت عائشہ نے اصرار کر کے ان سے کہوا کر معلوم کر لیا۔ جب دونوں مجرم ٹھہرتیں۔ اس روایت میں بلکہ کسی روایت میں بھی اس کی تصریح نہیں ہے تو دونوں مجرم کیونکر ٹھہر سکتی ہیں۔

۸۔ بالفرض حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ سے قصور ہوا تھا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صرف انہیں دونوں سے ایک ماہ علیٰحدگی کی قسم کھاتے ان دونوں کے سوا باقی بیبیوں نے کیا قصور کیا تھا جو آپ نے قصور وار و بے قصور سب کے ساتھ

بالکل یکساں برتاؤ کیا؟ یہ تو صریحاً ظلم ہے جس کو اس حدیث کے گھڑنے والے نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے
نمبر۲ مذکورہ بالا عبارت کے بعد یہ عبارت ہے۔ وکان قد قال ما انا بداخل علیھن شھراً من شدۃ موجدتہ علیھن حین عاتبہ اللہ یعنی" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا کہ ان لوگوں کے پاس میں نہیں جانے کا ایک مہینے تک۔ غایت غصہ کے باعث جو آپکو ان سب پر ہوا جبکہ اللہ نے آپ پر عتاب کیا" اس افسانہ کا ذکر سورہ احزاب ہی میں ہے اور کسی جگہ تو ہے نہیں اس میں جو کچھ عتاب کی جھلک ہے وہ ان دو بیبیوں سے متعلق ہے جنہوں نے رازِ رسول کے متعلق تظاہر یا مظاہرہ کیا تھا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر عتاب کا اشارہ تو درکنار کہیں وہم بھی نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ آپ کے ساتھ ہمدردی کی گئی ہے اور آپکی حمایت کی گئی ہے۔ آپ پر عتاب کہاں کیا گیا ہے جو کہا جائے کہ چونکہ آپ پر اللہ نے عتاب کیا ان دو بیبیوں کیوجہ سے تو آپ نے ان دو ہی پر نہیں بلکہ ان سب بیبیوں پر عتاب فرمایا۔ یہ ایک عجیب بات اس حدیث میں ہے۔

نمبر۳ خاتمہ حدیث میں جو مذکور ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سورہ احزاب کے رکوع کی ابتدائی آیتیں جن کو آیات تخییر کہتے ہیں یا ایھا النبی قل لازواجک سے عظیما تک سب سے پہلے اپنے حجرے کے ۲۹ دن پر جا اتر کے آئے تو حضرت عائشہ کے پاس پہنچے تھے اور اسکے بعد یہ تخییر کی آیتیں اتریں تو اس کے لئے بھی سب سے پہلے حضرت عائشہ ہی کے پاس آپ پہنچے اور ان سے فرمایا کہ میں تم کو کچھ نصیحت کی باتیں کہنے کے لئے آیا ہوں تم جلدی نہ کرو اور سوچ سمجھکر بلکہ اپنے والدین سے پوچھ کر ان کے مشورے کے بعد اس کا جواب دو۔ اس کے بعد عبارت ہے قالت قد علم ان ابوی لم یکونا یا مرانی بفراقک۔ اس عبارت میں عجیب دشواری ہے علم کی ضمیر غائب بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف پھرتی ہے اور بفراقک کی ضمیر مخاطب کے مخاطب بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ ایک ہی جملے میں آپکو غائب بھی قرار دیا ہے اور حاضر بھی۔ یا تو علم علمت کہئے تو یہاں بفراقک صحیح ہوگا اور اگر وہاں قد علم ہی رکھنا ہے تو یہاں بفراقہ کہیے۔ جیسا کہ بخاری کے دوسرے راویوں نے بخاری کی اس غلطی کو صحیح کرنے کیلئے بفراقہ اسکے بنانے کی کوشش کی ہے اور مطبوعہ نسخوں کے حاشیے پر بفراقہ بھی عموماً لکھدیتے ہیں لیکن اصل کتاب جو دنیا میں شائع ہے یہاں تک کہ حافظ ابن حجر کے سامنے بھی فتح الباری لکھنے کے وقت جو نسخہ تھا اس میں وہاں قد علم اور یہاں بفراقک ہی ہے۔ مگر ابن حجر وغیرہ شارحین بالکل کھا گئے ہیں شرح میں ان غلطیوں کو چھوا تک نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ابھی تو آپ نے آیہ تخییر پڑھی ہی نہیں ہے مقطعاً نا ہی کہا ہے کہ ایک بات تم سے کہنے کیلئے آیا ہوں اسکا جواب تم اپنے والدین سے پوچھ کے دو۔ ابھی حضرت عائشہ نے کیسے سمجھ لیا کہ مفارقت کے لئے کہا جائیگا۔ جو فرما رہی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو جانتے ہی تھے کہ میرے والدین مفارقت کی کبھی رائے نہ دیں گے۔ وہ آیہ تخییر سننے کے بعد انہوں نے کہا ہوگا پہلے کیسے کہیں گی۔

نمبر۴ حضرت عائشہ کی والدہ ماجدہ حضرت ام رومان کی وفات سنہ ۴ھ میں ہے اور آیہ تخییر کا نزول بقول محدثین سنہ ۹ھ میں اس لئے آیہ تخییر کے نزول کے وقت حضرت ام رومان زندہ ہی نہیں تھیں اس لئے والدین سے پوچھنے کے لئے آپ اسوقت کبھی نہیں فرماتی یقیناً صرف والد سے پوچھنے کیلئے فرماتیں یا اپنے اولیاء سے پوچھنے کیلئے فرماتیں۔ یا سوتیلی ماں سے ممکن ہے کہ ابوبکر سے باپ اور سوتیلی ماں مراد لے لئے جائیں۔ مگر اسی جھوٹی حدیث سے لوگوں نے حضرت ام رومان کی وفات کے سنہ میں خواہ مخواہ اختلاف پیدا کر دیا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار (باقی)

بازیچۂ اطفال

اسلامی قوانین سازی کے سلسلے میں ہم شروع سے یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ اگر آپ نے احادیث کو قرآن کریم کے تابع نہ رکھا اور انہیں قانون کا اساس مدار قرار دے دیا تو اسلامی مملکت کے لئے ایسا ضابطۂ قوانین مرتب ہو ہی نہیں سکے گا جو متفق علیہ ہو۔ اس لئے کہ ہماری کتب روایات کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں موافق اور مخالف ہر قسم کی حدیثیں مل جاتی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ امت میں اسقدر فرقے ہیں اور ہر فرقہ اپنے مسلک کی تائید میں احادیث پیش کر دیتا ہے۔ لیکن احادیث کی کیفیت اتنی ہی نہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک ہی حدیث سے کسی معاملہ کے موافق بھی دلیل لائی جا سکتی ہے اور مخالف بھی۔ یہ بات آپ کے لئے وجہ حیرت ہوگی لیکن ہے یہ حقیقت۔

آج کل یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر رہا ہے کہ اسلام میں

عورت سربراہِ مملکت بن سکتی ہے یا نہیں

اس موضوع پر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے تفصیلی بحث کی اور احادیث کی رو سے ثابت کیا کہ اسلام میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ان کے اس مقالہ (یا اشارات) سے ہم اس سے پہلے جستہ جستہ اقتباسات درج طلوع اسلام کر چکے ہیں۔ لیکن موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ہم اسے اس جگہ بتمامہ درج کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

مودودی صاحب کی تصریحات

" تیسرا اعتراض ہماری اس تجویز پر کیا گیا ہے کہ عورتوں کو مجالس قانون ساز کا رکن نہ ہونا چاہیئے۔ اس باب میں ہم سے پوچھا گیا ہے کہ وہ کون سے اسلامی اصول ہیں جو ان کی رکنیت میں مانع ہیں، اور قرآن و حدیث کے وہ کونسے ارشادات ہیں جو ان مجالس کی رکنیت کو مردوں کے لیے مخصوص قرار دیتے ہیں؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم ان مجالس کی صحیح نوعیت اچھی طرح واضح کردیں جن کی رکنیت کے لئے عورتوں کے استحقاق پر گفتگو کی جارہی ہے۔ ان مجالس کا نام مجالس قانون ساز رکھنے سے یہ غلط فہمی واقع ہوتی ہے کہ ان کا کام صرف قانون بنانا ہے، اور پھر یہ غلط فہمی ذہن میں رکھ کر جب آدمی دیکھتا ہے کہ عہد صحابہ میں خواتین بھی قانونی مسائل پر بحث، گفتگو، اظہار رائے، سب کچھ کرتی تھیں اور بسا اوقات خود خلفاء ان کی رائے لیتے اور اس رائے کا لحاظ کرتے تھے، تو اسے حیرت ہوتی ہے کہ آج اسلامی اصولوں کا نام لیکر اس قسم کی مجالس میں عورتوں کی شرکت کو غلط کیسے کہا جا سکتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جو مجالس اس نام سے موسوم کی جاتی ہیں ان کا کام محض قانون سازی کرنا نہیں ہے بلکہ عملاً وہی پوری ملکی سیاست کنٹرول کرتی ہیں، وہی وزارتیں بناتی اور توڑتی ہیں، وہی نظم و نسق کی پالیسی طے کرتی ہیں، وہی مالیات اور معاشیات کے مسائل طے کرتی ہیں، اور انہی کے ہاتھ میں صلح و جنگ کی زمام کار ہوتی ہے۔ اس حیثیت سے ان مجالس کا مقام محض ایک فقیہ اور مفتی کا مقام نہیں ہے بلکہ پوری مملکت کے "قوام" کا مقام ہے۔

اب ذرا دیکھیے، قرآن اجتماعی زندگی میں یہ مقام کس کو دیتا ہے اور کسے نہیں دیتا۔ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (رکوع ۲)

مرد عورتوں پر قوام ہیں، بوجہ اس فضیلت کے جو اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر دی ہے، اور بوجہ اس کے کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس صالح عورتیں اطاعت شعار اور غیب کی حفاظت کرنے والیاں ہوتی ہیں اللہ کی حفاظت کے تحت۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ صاف الفاظ میں قوامیت کا مقام مردوں کو دے رہا ہے اور صالح عورتوں کی دو خصوصیات بیان کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اطاعت شعار ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ مردوں کی غیر موجودگی میں ان چیزوں کی حفاظت کریں جن کی حفاظت اللہ کرانا چاہتا ہے۔

آپ کہیں گے کہ یہ حکم تو خانگی معاشرت کے لئے ہے نہ کہ ملکی سیاست کے لئے۔ مگر یہاں اول تو مطلقاً اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ کہا گیا ہے، فی البیوت کے الفاظ ارشاد نہیں ہوئے ہیں جن کو بڑھائے بغیر اس حکم کو خانگی معاشرت تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اگر آپ کی یہ بات مان بھی لی جائے تو ہم پوچھتے ہیں کہ جسے اللہ نے گھر میں قوام نہ بنایا بلکہ قنوت (اطاعت شعاری) کے مقام پر رکھا، آپ اسے تمام گھروں کے مجموعے، یعنی پوری مملکت میں قنوت کے مقام سے اٹھا کر قوامیت کے مقام پر لانا چاہتے ہیں؟ گھر کی قوامیت سے مملکت کی قوامیت تو زیادہ بڑی اور

اونچے درجے کی ذمہ داری ہے۔ اب کیا اللہ کے متعلق آپ کا یہ گمان ہے کہ وہ ایک گھر میں تو عورت کو قوام نہ بنائیگا مگر کئی لاکھ گھروں کے مجموعے پر اسے قوام بنا دے گا !

اور دیکھئے، قرآن صاف الفاظ میں عورت کا دائرۂ عمل یہ کہہ کر معین کر دیتا ہے کہ

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ (الاحزاب - ۳۳)

اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ ٹھیری رہو اور پچھلی جاہلیت کے سے تبرج کا ارتکاب نہ کرو۔

آپ پھر فرمائیں گے کہ یہ حکم تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی خواتین کو دیا گیا تھا۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ آپ کے خیال مبارک میں کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی خواتین کے اندر کوئی خاص نقص تھا جس کی وجہ سے وہ بیرون خانہ کی ذمہ داریوں کے لئے نااہل تھیں؟ اور کیا دوسری خواتین کو اس لحاظ سے اُن پر کوئی فوقیت حاصل ہے؟ پھر اگر اس سلسلے کی ساری آیات صرف اہل بیت نبوت کے لئے مخصوص ہیں تو کیا دوسری مسلمان عورتوں کو تبرج جاہلیت کی اجازت ہے؟ اور کیا انہیں غیر مردوں سے اس طرح باتیں کرنے کی بھی اجازت ہے کہ اُن کے دل میں طمع پیدا ہو؟ اور کیا اللہ اپنے نبی ؐ کے گھر کے سوا ہر مسلمان گھر کو "رجس" میں آلودہ دیکھنا چاہتا ہے؟

اس کے بعد حدیث کی طرف آیئے۔ یہاں ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ واضح ارشادات ملتے ہیں:-

إِذَا كَانَ أُمَرَاؤُكُمْ شِرَارَكُمْ وَأَغْنِيَاؤُكُمْ بُخَلَاءَكُمْ وَأُمُورُكُمْ إِلَى نِسَائِكُمْ فَبَطْنُ الْأَرْضِ خَيْرٌ مِنْ ظَهْرِهَا (ترمذی)

جب تمہارے امراء تمہارے بدترین لوگ ہوں، اور جب تمہارے دولتمند بخیل ہوں اور جب تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے ہاتھ میں ہوں تو زمین کا پیٹ تمہارے لئے اس کی پیٹھ سے بہتر ہے۔

عَنْ أَبِي بَكْرَةَ لَمَّا بَلَغَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ أَهْلَ فَارِسَ مَلَّكُوا عَلَيْهِمْ بِنْتَ كِسْرَىٰ قَالَ لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمْ امْرَأَةً۔ (بخاری، احمد، نسائی، ترمذی)

ابو بکرہ سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ ایران والوں نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنا لیا ہے تو آپ نے فرمایا وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کئے ہوں۔

یہ دونوں حدیثیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ کی ٹھیک ٹھیک تفسیر بیان کرتی ہیں۔

فعل کو اسی زمانے میں جلیل القدر صحابہؓ نے غلط قرار دیا تھا، اور جس پر بعد میں خود ام المومنین بھی نادم ہوئیں۔ اسے آخر کس طرح اسلام میں ایک نئی بدعت کا آغاز کرنے کے لئے دلیل قرار دیا جا سکتا ہے؟

حضرت عائشہؓ کے اس اقدام کی اطلاع پاتے ہی ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے ان کو جو خط لکھا تھا وہ پورا کا پورا ابن قتیبہ نے الامامۃ والسیاسۃ اور ابن عبدربہ نے عقد الفرید میں نقل کیا ہے۔ اسے ملاحظہ فرمایئے۔ کتنے پرزور الفاظ میں وہ فرماتی ہیں کہ "آپ کے دامن کو قرآن نے سمیٹ دیا ہے۔ آپ اسے پھیلایئے نہیں" اور "کیا آپ کو یاد نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو دین میں افراط برتنے سے روکا ہے؟" اور یہ کہ "آپ رسول اللہ کو کیا جواب دیتیں اگر وہ آپ کو اس طرح کسی صحرا میں ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ کی طرف اونٹ دوڑاتے ہوئے دیکھ لیتے؟"

پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس قول کو یاد کیجیے کہ "عائشہ کے لئے ان کا گھر آن کے ہودے سے بہتر ہے۔"

اور حضرت ابوبکرہؓ کا یہ قول بخاری میں ملاحظہ فرمایئے کہ جنگ جمل کے فتنے میں مبتلا ہونے سے صرف اس لئے بچ گیا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد یاد آ گیا کہ "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کر دیئے ہوں"۔

حضرت علیؓ سے بڑھ کر اس زمانے میں کون شریعت کا ماننے والا تھا؟ انہوں نے صاف الفاظ میں حضرت عائشہ کو لکھا کہ آپ کا یہ اقدام حدود شریعت سے متجاوز ہے، اور حضرت عائشہؓ اپنی کمال درجے کی ذہانت و فقاہت کے باوجود اس کے جواب میں کوئی دلیل نہ پیش کر سکیں۔ حضرت علیؓ کے الفاظ یہ تھے کہ "بلاشبہ آپ اللہ اور اس کے رسول ہی کی خاطر غضبناک ہو کر نکلی ہیں۔ مگر آپ ایک ایسے کام کے پیچھے پڑی ہیں جس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ڈالی گئی ہے۔ عورتوں کو آخر جنگ اور اصلاح بین الناس سے کیا تعلق؟ آپ عثمان کے خون کا دعویٰ لے کر اٹھی ہیں، مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جس شخص نے آپ کو اس بلا میں ڈالا اور اس معصیت پر آمادہ کیا وہ آپ کے حق میں عثمان کے قاتلوں سے زیادہ گناہگار ہے؟"

دیکھیے، اس خط میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ کے فعل کو صریحاً خلاف شرع قرار دے رہے ہیں۔ مگر حضرت عائشہ اس کا کوئی جواب اس کے سوا نہ دے سکیں کہ جل الامر عن العتاب۔ معاملہ اب اس حد سے گزر چکا ہے کہ عتاب و ملامت سے کام چل سکے۔

پھر جنگ جمل کے خاتمے پر جب علیؓ ام المومنینؓ سے ملنے تشریف لے گئے تو انہوں نے کہا:

یَا صَاحِبَۃَ الْھَوْدَجِ قَدْ اَمَرَکِ اللّٰہُ اَنْ تَقْعُدِیْ فِیْ بَیْتِکِ ثُمَّ خَرَجْتِ تُقَاتِلِیْنَ!

اے ہودے والی اللہ نے آپ کو گھر بیٹھنے کا حکم دیا تھا اور آپ لڑنے کے لئے نکل پڑیں؟ مگر اس وقت حضرت

فعل کو اُسی زمانے میں جلیل القدر صحابہؓ نے غلط قرار دیا تھا، اور جس پر بعد میں خود ام المومنینؓ نادم ہوئیں۔ اسے آخر کس طرح اسلام میں ایک نئی بدعت کا آغاز کرنے کے لئے دلیل قرار دیا جا سکتا ہے؟

حضرت عائشہؓ کے اس اقدام کی اطلاع پاتے ہی ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے ان کو جو خط لکھا تھا وہ پورا کا پورا ابن قتیبہ نے الامامۃ والسیاسۃ اور ابن عبدربہ نے عقد الفرید میں نقل کیا ہے۔ اسے ملاحظہ فرمائیے۔ کتنے پر زور الفاظ میں وہ فرماتی ہیں کہ "آپ کے دامن کو قرآن نے سمیٹ دیا ہے۔ آپ اسے پھیلائیے نہیں" اور "کیا آپ کو یاد نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو دین میں افراط برتنے سے روکا ہے؟ اور یہ کہ "آپ رسول اللہ کو کیا جواب دیتیں اگر وہ آپ کو اس طرح کسی صحرا میں ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ کی طرف اونٹ دوڑاتے ہوئے دیکھ لیتے؟"

پھر حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے اس قول کو یاد کیجئے کہ "عائشہ کے لئے ان کا گھر ان کے ہودے سے بہتر ہے۔"

اور حضرت ابوبکرہؓ کا یہ قول بخاری میں ملاحظہ فرمالیجیے کہ جنگ جمل کے فتنے میں مبتلا ہونے سے صرف اس لئے بچ گیا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد یاد آگیا کہ "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کر دیئے ہوں۔"

حضرت علیؓ سے بڑھ کر اس زمانے میں کون شریعت کا ماننے والا تھا؟ انہوں نے صاف الفاظ میں حضرت عائشہ کو لکھا کہ آپ کا یہ اقدام حدود شریعت سے متجاوز ہے، اور حضرت عائشہؓ اپنی کمال درجے کی ذہانت و فقاہت کے باوجود اس کے جواب میں کوئی دلیل نہ پیش کر سکیں۔ حضرت علیؓ کے الفاظ یہ تھے کہ "بلاشبہ آپ اللہ اور اس کے رسول ہی کی خاطر غضبناک ہو کر نکلی ہیں۔ مگر آپ ایک ایسے کام کے پیچھے پڑی ہیں جس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ڈالی گئی۔ عورتوں کو آخر جنگ اور اصلاح بین الناس سے کیا تعلق؟ آپ عثمان کے خون کا دعویٰ لے کر اٹھی ہیں، مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جس شخص نے آپ کو اس بلا میں ڈالا اور اس معصیت پر آمادہ کیا وہ آپ کے حق میں عثمان کے قاتلوں سے زیادہ گناہ گار ہے۔"

دیکھیئے، اس خط میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ کے فعل کو صریحاً خلاف شرع قرار دے رہے ہیں۔ مگر حضرت عائشہ اس کا کوئی جواب اس کے سوا نہ دے سکیں کہ جل الامر عن العتاب - معاملہ اب اس حد سے گزر چکا ہے کہ عتاب و ملامت سے کام چل سکے۔

پھر جنگ جمل کے خاتمے پر جب علیؓ ام المومنینؓ سے ملنے تشریف لے گئے تو انہوں نے کہا۔

يَا صَاحِبَةَ الْهَوْدَجِ قَدْ أَمَرَكِ اللّٰهُ أَنْ تَقْعُدِي فِي بَيْتِكِ ثُمَّ خَرَجْتِ تُقَاتِلِينَ!

"اے ہودے والی۔ اللہ نے آپ کو گھر بیٹھنے کا حکم دیا تھا اور آپ لڑنے کے لئے نکل پڑیں۔" مگر اس وقت حضرت

عائشہ یہ نہ کہہ سکیں کہ اللہ نے ہم عورتوں کو گھر بیٹھنے کا حکم نہیں دیا ہے اور ہمیں سیاست اور جنگ میں حصہ لینے کا حق ہے

ان سب سے بڑھ کر یہ خود نبی صلی علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو اس فتنے پر متنبہ کر دیا تھا۔ ابن تیتیبہ کی روایت ہے کہ بصرے کے راستے میں جب حضرت عائشہ حوأب کے مقام پہنچیں تو کتے بھونکتے ہوئے ان کے ہودے کی طرف لپکے۔ حضرت عائشہ نے چونک کر پوچھا یہ کونسا مقام ہے۔ محمد بن طلحہ نے عرض کیا حوأب۔ حضرت عائشہ نے فرمایا۔ اب میں آگے نہیں جا سکتی۔ مجھے یہیں سے پلٹنا ہے۔ پوچھا "کیوں؟" فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی بیویوں سے یہ کہتے سنا ہے کہ تم میں سے کسی پر حوأب کے کتے بھونک رہے ہیں، اور پھر آپ نے مجھ سے خطاب کر کے فرمایا کہ " خبردار! اے حمیرا کہیں وہ تم ہی نہ ہو" آخر کار حضرت عائشہ کو قسم کھا کر یقین دلایا گیا کہ یہ مقام حوأب نہیں ہے، جب وہ آگے چلنے پر راضی ہوئیں۔ ابن قتیبہ کہتا ہے کہ پہلی جھوٹی شہادت تھی جو اسلام میں دی گئی۔

پھر یہ بھی ثابت ہے کہ آخر کار حضرت عائشہؓ خود اپنے اس فعل پر پچھتاتی رہیں۔ چنانچہ علامہ ابن عبدالبر استیعاب میں یہ روایت لائے ہیں کہ ام المومنینؓ نے عبداللہ بن عمرؓ سے شکایۃً فرمایا "اے ابو عبدالرحمٰن تم نے کیوں نہ مجھے اس کام پر جانے سے منع کیا؟" انہوں نے جواب دیا "میں نے دیکھا کہ ایک شخص (یعنی عبداللہ بن زبیر) آپ کی رائے پر حاوی ہو گیا ہے اور مجھے امید نہ تھی کہ آپ اس کے خلاف چل سکیں گی" اس پر ام المومنینؓ نے فرمایا "کاش تم مجھے منع کر دیتے تو میں نہ نکلتی۔"

اس کے بعد جناب صدیقہ کے عمل میں آخر کیا دلیل باقی رہ جاتی ہے جس کے بل بوتے پر کوئی صاحب علم یہ دعویٰ کر سکتا ہو کہ اسلام میں عورتیں بھی سیاست اور نظم مملکت کی ذمہ داری میں شریک قرار دی گئی ہیں؟ رہے وہ لوگ جن کے لئے اصل معیار حق صرف دنیا کی غالب قوموں کا طرز عمل ہے، اور جنہیں بہرحال چلنا اُسی طرف ہے جس طرف ابنوہ جا رہا ہو، تو انہیں کس نے کہا ہے کہ اسلام کو اپنے ساتھ ضرور لے چلیں؟ ان کا جدھر جی چاہے شوق سے جائیں مگر کم از کم اتنی راستبازی تو ان ہونی چاہیئے کہ جس مقتدار کے دراصل وہ پیرو ہیں اُسی کا نام لیں، بلا دلیل اسلام کی طرف وہ باتیں منسوب نہ کریں جس سے خدا کی کتاب، اور اس کے رسول کی سنت، اور قرون مشہود لہا بالخیر کی تاریخ صاف صاف انکار کر رہی ہے۔ (ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۵۲ء۔ اشارات)

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے۔ اب جماعت اسلامی کو ضرورت پیش آئی کہ عورت کی سربراہی کو جائز قرار دیا جائے تو اس کے لئے جماعت کے تازہ ترجمان۔ ہفت روزہ "ایشیا" کی ۱۰ ر نومبر ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں۔ مولانا محمد اسلم

کے نام سے ۔ ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔

" اسلام نے مردوں اور عورتوں کے دائرہ ہائے کار کی تقسیم کا جو اصول پیش کیا ہے اس پر اہل علم کا اتفاق رہا ہے اور اس عمومی مزاج کو بتلانے میں بخاری شریف میں روایت کردہ ایک حدیث خاص طور پر اہم ہے ۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ اپنی کتاب کے دو ابواب میں نقل کرتے ہیں ۔ ایک باب "کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی کسریٰ وقیصر" ہے اور دوسرا "کتاب الفتن" ہے ۔ بخاریؒ کے علاوہ دوسرے محدثینؒ میں سے ترمذیؒ نے بھی باب "کتاب الفتن" میں روایت کی ہے اور نسائیؒ نے اپنی کتاب کے باب "فضائل" میں اس حدیث کا ذکر کیا ہے ۔ بخاری کے راوی ابوبکرہ ہیں اور ترمذی ونسائی کے راوی محمد بن مثنیٰؒ ہیں ۔ حدیث درج ذیل ہے

حدثنا عثمان بن الھیثم قال حدثنا عوف عن الحسن عن ابی بکرۃ قال لقد نفعنی اللہ بکلمۃ سمعتہا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایام الجمل بعد ماکدت ان الحق باصحاب الجمل ما قاتل معہم قال لما بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اھل فارس قد ملکوا علیہم بنت کسریٰ قال لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ (بخاری باب کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی کسریٰ وقیصر)

(بخاری کہتے ہیں) ہم سے روایت کی عثمان بن الہیثمؒ نے انہوں نے کہا ہم سے روایت کی عوفؒ نے حسنؒ سے اور حسن نے ابی بکرہؓ سے کہ مجھے جنگ جمل میں اللہ تعالیٰ نے اس قول سے بڑا نفع عنایت فرمایا جس کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا ۔ میں عائشہؓ کے لشکر میں تھا اور قریب تھا کہ مسلمانوں سے مقاتلہ کرتا کہ آنحضرت صلعم کا ارشاد یاد آگیا جو آپ نے کسریٰ کی بیٹی کے تخت نشین ہونے کی خبر سن کر فرمایا تھا کہ وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پا سکتی جو اپنے معاملات ایک عورت کے حوالے کر دے ؟

حدیث کے بارے میں اس کی سند کا تذکرہ کرتے ہوئے امام ترمذیؒ کہتے ہیں ۔

یہ حدیث (سند کے اعتبار سے) صحیح ہے ۔

حدیث کا مفہوم اور اس کا حکم

اس حدیث کے اگر صرف ظاہری الفاظ کو سامنے رکھا جائے تو اس سے جو تبادر مفہوم سامنے آتا ہے وہ یہی ہے کہ عورتوں کو اجتماعی زندگی میں مقام امر پر فائز کرنا درست نہیں ۔ لیکن معاملہ اتنا مختصر نہیں ہے ۔ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ ابن حجر عسقلانیؒ فتح الباری میں لکھتے ہیں

قال الخطابی فی الحدیث ان المراۃ لا تلی الامارۃ ولا القضاء وفیہ انہا لا تزوج نفسہا ولا تلی العقد علی غیرھا کذا قال وھو متعقب والمنع من ان

فی الامارۃ والقضاء قول الجمہور واجازہ الطبری وھی روایۃ عن مالک وعن ابی حنیفۃ تلی الحکم فیما تجوز فیہ شہادۃ النساء۔

(فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۹۸)

خطابی اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ عورت کو امارت اور قضاء کا عہدہ نہیں سپرد کیا جائے گا اس لئے کہ وہ نہ تو خود اپنا نکاح کر سکتی ہے اور نہ کسی دوسری عورت کے نکاح کی ولی بن سکتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہا ہے کہ وہ امارت اور قضاء کو قبول کرنے سے روکی جائے گی یہ جمہور کا قول ہے اور علامہ طبریؒ نے اس کی اجازت دی ہے اور یہی امام مالک اور امام ابوحنیفہؒ سے بھی روایت ہے (یہ تینوں حضرات کہتے ہیں) کہ جن معاملات میں عورتوں کی قیادت قبول کی جائیگی اس میں وہ صاحب امر بھی بنے گی۔

اس تشریح سے یہ معلوم ہوا کہ علامہ طبری، امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ علیہم اجمعین خواتین کی امارت و قضاء کے جواز کے قائل ہیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ علامہ ابن حجرؒ تو یہ فرماتے ہیں۔

ابن تین کہتے ہیں کہ اسی حدیث سے ابن جریر طبری نے جواز کا استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ جن معاملات میں اس کی شہادت قبول کی جائے گی ان میں قضاء جائز ہے اور بعض مالکیہ نے جواز کو عام رکھا ہے اور اس پر کوئی قید نہیں لگائی (کتاب الفتن فتح الباری صفحہ ۴۷)

گو حدیث کے ظاہری الفاظ عدم جواز پر دلالت کرتے ہیں اور تمام متعلقہ امور کا احاطہ کرنے کے بعد اہل علم کے ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ عورتوں کو امارت و قضاء کے مقام پر فائز کیا جا سکتا ہے۔ یہ رائے اپنی کچھ بنیادیں رکھتی ہے جنہیں ہم اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

(۱) اس رائے کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ یہ حدیث فی الحقیقت حضورؐ کی ایک بددعا ہے چنانچہ علامہ ابن حجر کسریٰ اور اس کی اولاد نرینہ کے قتل اور اس کی بیٹی پوران دخت کے بادشاہ بننے کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

یہ امر اس کی سلطنت کے خاتمہ کا باعث بنا اور وہ جیسا کہ ان کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا فرمائی تھی پارہ پارہ کر دیئے گئے۔

علامہ قسطلانی اسی رائے کے حامی ہیں کہ یہ حدیث صرف حضور کی بددعا کا تذکرہ کرتی ہے اس لئے خواتین کی امارت و قضاء کے عہدے قبول کرنے کا عدم جواز ثابت نہیں ہوتا چنانچہ اس بات کو کہنے کے بعد فرماتے ہیں۔

استجاب اللہ دعاء صلی اللہ علیہ وسلم۔

[ارشاد الساری علامہ قسطلانی جلد ۷ صفحہ ۱۱۷ بحوالہ عون الباری نواب صدیق حسن خان قنوجی ۱۳۰۴ھ]

۲۔ پھر علامہ کرمانی یہ بتلاتے ہیں کہ ابوبکرہؓ اس حدیث سے صرف تفاؤل کرتے ہیں چنانچہ وہ اپنی کتاب شرح بخاری

کے باب الفتن میں لکھتے ہیں۔

معروف یہ ہے کہ ابو بکرہ حضرت عائشہ کی رائے پر تھے پس انہوں نے بنت کسریٰ سے تفاؤل کیا کہ وہ (حضرت علی اور ان کے ساتھی) غالب آجائیں گے اور فلاح تو بقاء کو کہتے ہیں۔

(کرمانی شرح بخاری کتاب الفتن جلد ۲۴ صفحہ ۲۰۱)

۳۔ اور تیسرے یہ کہ حضرت ابو بکرہ کی اپنی رائے جو اس حدیث کے راوی بھی ظاہری مفہوم سے مختلف بلکہ برعکس تھی۔ چنانچہ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں۔

ابو بکرہؓ کی اس روایت سے حضرت عائشہؓ کی رائے کی توہین کا شبہ ہوتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس لئے کہ ابو بکرہؓ کا مسلک معروف یہ ہے کہ وہ حضرت عائشہ کی رائے پر تھے۔ اور انہیں کی فوج میں شریک تھے۔ اور ان کا (یعنی گروہ عائشہ کا) ارادہ قتال کا نہ تھا بلکہ اصلاح بین الناس تھا لیکن جب لڑائی چھڑ گئی تو حضرت عائشہؓ کو جنگ کے سوا چارہ نہ رہا اور (ولم یرجع ابو بکرہ عن رائ عائشہ) ابو بکرہؓ حضرت عائشہ کی رائے سے پھرے نہیں بلکہ انہوں نے فال لی جب انہوں نے لوگوں کو حضرت عائشہؓ کے ماتحت دیکھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے فتح پائی تو ابو بکرہؓ نے اپنی بابت ترک قتال پر خدا کا شکر ادا کیا۔ باوجودیکہ ان کی رائے طلب قصاص میں حضرت عائشہ کی رائے کے موافق تھی۔

(فتح الباری کتاب الفتن صفحہ ۴۷)

اب تک کے بیان سے آپ کے سامنے تین باتیں آچکی ہیں ایک یہ حدیث ایک بددعا پر مشتمل ہے۔ اور دوسرے یہ کہ حضرت ابو بکرہؓ اس سے تفاؤل کرتے ہیں، اور اس سے جواز و عدم جواز کا کوئی مسئلہ مستنبط نہیں کرتے۔ اور تیسرے یہ کہ اس حدیث کے ناقل ہونے کے باوجود ابو بکرہؓ عورتوں کی قیادت کے عدم جواز کے قائل نہ تھے۔

حضرت عائشہ کی قیادت کا مسئلہ

اگر امارت و قضاء میں عورتوں کی شرکت کا عدم جواز اسی حدیث سے ثابت ہوتا تو تمام صحابہ اس کو اسی حیثیت سے لیتے۔ حتیٰ کہ حضرت علیؓ بھی جب حضرت زبیرؓ سے ایک حدیث روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ تم ایک دن ان سے (علیؓ سے) لڑوگے لیکن تم حق پر نہ ہوگے" تو زبیرؓ اپنی رائے سے باز آجاتے ہیں اور واپسی میں ہی ان کو شہید کر دیا جاتا ہے۔ لیکن حضرت عائشہ سے نہ ابو بکرہؓ اس حدیث کو نقل کر کے ان کی قیادت کے عدم جواز کو ثابت کرتے ہیں اور نہ حضرت علیؓ۔ اگر حضرت ابو بکرہؓ اس حدیث سے عورتوں کی قیادت کی حرمت کے قائل ہوتے تو وہ حضرت عائشہؓ کی قیادت قبول نہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اسی بنیاد پر علامہ ابن حجر عسقلانی بھی یہ رائے ظاہر فرما رہے ہیں کہ اس حدیث سے جواز تو ثابت ہوتا ہے، عدم جواز ثابت نہیں ہوتا: البتہ ابو بکرہؓ نے اس حدیث سے جنگ کے

فیصلہ کے بارے میں ایک خام ل بی تھی اور اسی بنا پر ان کی رائے یہ تھی کہ جیش عائشہؓ کو کامیابی حاصل نہ ہوگی اور اس لئے وہ قتال سے باز رہے اور اپنے اس فیصلہ پر خدا کا شکر ادا کیا۔ چنانچہ علامہ کرمانی لکھتے ہیں

اس لئے ان کی رائے (مقابلہ کے بارے میں) کمزور ہوگئی۔

(کرمانی کتاب الفتن شرح بخاری جلد ۲۴ - صفحہ ۱۷۳)

اس سلسلے میں علامہ ابن حجر فتح الباری میں یہ لکھتے ہیں

" ابوبکرہؓ کا کلام اس کی شہادت دیتا ہے کہ اگر حضرت عائشہ نہ ہوتیں تو وہ طلحہ و زبیر کے ساتھ ہوتے اس لئے کہ وہ دونوں ہی اس معاملے میں حضرت عائشہ کی رائے پر تھے "

(فتح الباری کتاب الفتن صفحہ ۴۷)

اس سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ اصل مسئلہ جس کی غلطی و صحت کا معاملہ ما بہ النزاع تھا خون عثمانؓ کا دعویٰ تھا نہ کہ حضرت عائشہ کی قیادت۔ اور یہی وجہ ہے کہ تمام صحابہ نے رائے عائشہ کے بارے میں تو اختلاف کیا لیکن قیادت کے بارے میں نہیں کیا۔ اور خود ابوبکرہؓ کا یہ عمل اس کی بیّن دلیل ہے

اب اس سلسلے میں "تنقیح طلب حضرت عائشہؓ کا عمل ہے۔ تو اس سلسلے میں یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ محاصرہ میں تھے جب حضرت عائشہؓ مکے حج کے لئے چلی گئیں۔ واپس آرہی تھیں کہ راستے میں باغیوں کے ہاتھوں حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر ملی۔ آگے بڑھیں تو حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ ملے جو مدینہ سے بھاگے چلے آرہے تھے انہوں نے بیان کیا :-

ان تحملنا یقشا ھرابا من المدینۃ من غوغاء واعزیب و فارقنا قوما حیاری لا یعرفون حقاً ولا ینکرون باطلاً ولا یمنعون انفسھم۔

(تاریخ طبری)

ہم لوگ مدینہ سے لدے پھندے بدوؤں اور عوام الناس کے ہاتھوں سے بھاگے چلے آتے ہیں، اور لوگوں کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ حیران و سرگرداں ہیں، نہ حق کو پہچان سکتے ہیں نہ باطل کے منکر ہیں اور نہ خود اپنی حفاظت پر قادر ہیں۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا باہم مشورہ کرو کہ اس موقع پر ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ پھر یہ شعر پڑھا :-

ولو ان قومی طاوعتنی سراتھم   لانقذتھم من الحبال او الخبل

اگر میری قوم کے سردار میری بات مانتے   تو میں ان کو اس خطرے سے باہر لے آتی

اور عمرہ بنت عبدالرحمٰن سے مروی ہے کہ ام المومنین نے فرمایا کہ اس قوم کی طرح کوئی قوم نہیں جو اس

آیت کے حکم سے اعراض کرتی ہو (موطا امام محمد باب التفسیر) وہ آیت یہ ہے :-

وان طائفتان من المومنين اقتتلوا فاصلحوا بينهما وان بغت احدٰهما على الاخرى فقاتلوا التى تبغى حتى تفئ الى امر الله فان فاءت فاصلحوا بينهما

اگر دو مسلمان جماعتیں لڑ جائیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو پس اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے تو ظلم کرنے والوں سے لڑو یہاں تک کہ حکم الہٰی کی طرف وہ رجوع کرے اور جب وہ رجوع کرے تو دونوں میں صلح کرا دو۔

اس کے علاوہ مسند ابن حنبل میں حضرت عائشہ رض کی زبانی تصریح مذکور ہے :-

قالت لما اتيت على الحوأب سمعت نباح الكلاب فقالت ما اظنني الا راجعة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ما ايتكن تنبح عليها كلاب الحوأب فقال لها الزبير ترجعين عسى الله ان يصلح بك بين الناس-

(مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۹۷)

جب حوآب آیا تو کتوں کے بھونکنے کی آواز سنی میں نے کہا اب تو میں اپنے کو واپس ہونے والی سمجھتی ہوں حضور صلعم نے ایک مرتبہ ہم لوگوں سے فرمایا تھا کہ تم میں سے کسی پر حوآب کے کتے بھونکیں گے ؛ زبیر نے کہا تم واپس جاؤ گی شاید اللہ تعالیٰ تمہارے سبب سے لوگوں میں صلح کرا دے۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ اس طرح آتے ہیں

فقال بعض من كان معها بل تقدمين فيراك المسلمون فيصلح الله عزوجل ذات بينهم (مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۹۷)

آپ کے ہمراہیوں میں سے کسی نے کہا بلکہ آپ آگے بڑھیں کہ مسلمان آپ کو دیکھیں تو خدا ان کے درمیان صلح کرا دے۔

اس روایت کے راوی قیس بن ابی حازم کو اکثر محدثین نے ثقہ اور ثبت کہا ہے لیکن بعضوں نے ان پر تنقید بھی کی ہے اور ان کی حوآب والی حدیث کی صحت پر کلام کیا ہے۔

(تہذیب التہذیب)

غرضیکہ ان روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ کی اس پیش قدمی اور جماعت بندی کا مقصود اصلاح کے سوا کچھ نہ تھا۔ حتیٰ کہ روایتوں میں یہاں تک آتا ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا "خدا کی قسم میں علی کی خلافت کے معاملے ان کی حریف نہیں ہوں میری غرض تو صرف اصلاح ہے"

یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ رض کے اس طرز عمل کو دیکھتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم فرماتے ہیں۔

" اگر ام المومنین سیاست گاہ عالم میں آئیں تو وہ اس امر کا ثبوت ہے کہ مسلمان عورت کے حقوق کا دائرہ اتنا تنگ نہیں ہے جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے "

سیرت عائشہ صفحہ ۱۱۳

" یہ صحیح ہے کہ عورت کے طبعی حالات فرائض امامت کے منافی ہیں اور خود اسلام نے امام کے لئے جو ضروری شرائط قرار دیئے ہیں اس سے یہ جنس لطیف کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے وہ امامت جمہوری اور خلافت الٰہی کے فرائض سے سبکدوش ہے لیکن اس سے یہ غلط استنباط نہیں کرنا چاہیئے کہ مسلمان عورت کو کسی حالت میں بھی پبلک کی سیاسی اور قومی رہبری جائز نہیں خصوصاً ایسی حالت میں جب ساری ملت میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک رہی ہو اور اس کے خیال میں مسلمانوں میں کوئی دوسرا اس فتنہ کو بجھانے والا نہ ہو " (سیرت عائشہ صفحہ ۱۱۴)

پھر اس کے علاوہ حضرت عائشہؓ حضرت ام سلمہؓ کے خط کے جواب میں جو لکھتی ہیں وہ بھی قابل غور ہے فرماتی ہیں۔

اس معاملے میں میری جانب دو گروہ جو آپس میں لڑ رہے ہیں، حائل ہوئے ہیں۔ پس اگر میں استطاعت رکھتی ہوں تو ہم اس معاملے میں کسی تنگی میں نہیں ہیں (یعنی شریعت نے ہم پر پابندی نہیں لگائی ہے۔) اس سے یہ بات بہرحال صاف ہو جاتی ہے کہ مخصوص حالات میں جب امت فتنہ و فساد میں مبتلا ہو اور اس بات کو سمجھنے کے لئے معقول وجوہ موجود ہوں کہ ایک خاتون کے سوا کوئی اور اس کام کو نہیں کر سکتا تو اس کے لئے اجتماعی زندگی میں قیادت کے فرائض انجام دینے کے لئے اجازت پیدا ہوتی ہے۔ (ختم شد)

آپ نے غور فرمایا کہ ایک ہی واقعہ سے ایک دفعہ یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ اسلام کے اصول ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتے کہ عورت کو مملکت کا سربراہ بنایا جائے۔ اس میں نہ کسی استثناء کا ذکر ہے۔ نہ اضطراری حالت کی گنجائش۔ اور وہی حدیث سے پھر یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ بعض حالات میں عورت کو سربراہ مملکت بنایا جا سکتا ہے۔ اور یہ کچھ بھی اسی جماعت کی طرف سے ثابت کیا جاتا ہے جس جماعت کے امیر پہلے وہ کچھ ثابت کر چکے ہیں۔ اور پھر "دیانتداری" ملاحظہ ہو کہ اس کا کہیں ذکر تک نہیں کیا جاتا کہ اس سے پہلے مودودی صاحب اس کے خلاف لکھ چکے ہیں۔ یہ مقالہ اس طرح شائع کیا جاتا ہے گویا یہ مسئلہ اس جماعت کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہے اور یہ جماعت تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہے۔ اس سے پہلے اس کے خلاف نتیجہ پر کبھی نہیں پہنچی۔

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ حضرات اس پر مصر کیوں ہیں کہ اسلامی قوانین کا مدار اساسی صرف قرآن نہیں بلکہ احادیث بھی ہونی چاہئیں۔ اس لئے کہ قرآن میں تو اختلافی بات کی گنجائش ہی نہیں۔ اور احادیث سے جو جی میں آئے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ موافق بھی مخالف بھی۔ احادیث تو وضع ہی اس لئے کی گئی تھیں۔

قرآن کریم کو سند اور معیار قرار دیجئے اور باقی ہر شے اس کے تابع رکھئے۔ پھر دیکھئے کس طرح ہر معاملہ کا صحیح، واضح اور ایک ہی حل سامنے آتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس سے مذہبی پیشوائیت کی من مانی ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہی وہ مشکل ہے جو انہیں قرآن کی طرف نہیں آنے دیتی۔

کتاب - قرآنی فیصلے - جلد سوئم - بھی شائع ہو گئی

اس کتاب کی پہلی دو جلدوں سے آپ نے اس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ کر لیا ہو گا۔ اب اس کی تیسری جلد کی اشاعت سے ان میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ تیسری جلد کے چیدہ چیدہ عنوانات ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ کمیونزم اور اسلام کا مقابلہ۔
۲۔ کیا سود لینا جائز ہے؟
۳۔ کیا صحابہؓ کے پاس دولت کے انبار تھے؟
۴۔ کیا ذرائع پیداوار قومی ملکیت میں لئے جا سکتے ہیں۔
۵۔ حضرت یوسفؑ نے زمین کا انتظام کس قسم کا کیا تھا۔
۶۔ رہن با قبضہ کی قرآنی حیثیت کیا ہے۔
۷۔ قرآن کی رُو سے وصیت کا کیا حکم ہے۔
۸۔ کیا یتیم پوتے کو وراثت میں حصہ مل سکتا ہے؟
۹۔ اوقاف کی قرآنی حیثیت کیا ہے۔
۱۰۔ کیا خدمت دین کا معاوضہ لینا جائز ہے؟
۱۱۔ اسلامک سوشلزم سے کیا مفہوم ہے۔
۱۲۔ کیا خدا عادل ہے؟
۱۳۔ شریف عورتوں کو چھیڑنے والے
۱۴۔ شراب کے متعلق قرآنی فیصلہ
۱۵۔ کیا غیر مسلموں کے نیک اعمال کا بدلہ ملیگا!
۱۶۔ تعلق باللہ سے کیا مراد ہے۔
۱۷۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کیا ہیں۔
۱۸۔ عقل اور وحی کا باہمی تعلق کیا ہے۔

یہ اور اس قسم کے اور متعدد سوالات کا جواب، قرآن کریم کی روشنی میں بڑی وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ عام اشاعت کی غرض سے کتاب کا چیپ ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔ ضخامت تین سو صفحات قیمت تین روپے۔ پیشگی خریداروں میں سے جو احباب کتاب نہ لینا چاہیں وہ اطلاع فرما دیں۔ باقی احباب کو کتاب از خود بھیجدی جائے گی۔ فرمائشوں کی تعمیل فرمائشیں موصول ہونے کی ترتیب کے مطابق کی جائے گی۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

۲۵/ بی۔ گلبرگ ——— لاہور

نقد و نظر

THOUGHTS AND REFLECTIONS OF IQBAL

یہ قوم کی بدقسمتی ہے کہ ہمارے مشاہیر کے اقوال و الفاظ (تحریریں، تقریریں، بیانات وغیرہ) محفوظ نہیں کئے جاتے حالانکہ وہ قوم کی متاعِ گراں بہا ہوتے ہیں۔ قائد اعظمؒ کی تقاریر و بیانات (دو جلدوں میں) تقسیم ہند سے پہلے شائع ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس سلسلہ میں سنا تو بہت کچھ لیکن عملاً ہوا کچھ بھی نہیں۔ اسی طرح علامہ اقبالؒ کی تقاریر اور بیانات کا ایک مجموعہ مدت ہوئی (۱۹۴۸ء میں) المنار اکادمی لاہور کی طرف سے شائع ہوا تھا لیکن وہ مدت سے نایاب ہے۔ ہمارے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس باب میں "بہ کبر سن لیکن جوان ہمت" اقبال کے شیدائی سید عبدالواحد صاحب نے ہمت کی اور ان کی انگریزی کی تحریروں اور تقریروں کا ایک مجموعہ مرتب کر دیا جسے شیخ محمد اشرف صاحب نے نہایت حسن ذوق سے چھاپا اور شائع کیا ہے۔ (اس قسم کی سعادت اکثر شیخ صاحب ہی کے حصے میں آتی ہے)۔

مرتب نے حضرت علامہ کی اس متاعِ گم گشتہ کو بڑی محنت سے تلاش کیا ہے اور مجموعہ میں بعض تحریریں ایسی ہیں جو اس سے پہلے کم ہی لوگوں کی نظروں سے گذری ہونگی۔ اس میں ان تقاریر اور بیانات کا بھی اکثر حصہ آ گیا ہے جو المنار اکادمی کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکی کہ المنار کے مجموعہ کے تمام مضامین اس میں شامل کیوں نہیں کر لئے گئے۔ نتیجہ یہ کہ یہ مجموعہ اس حد تک بھی ناقص رہ گیا جس حد تک حضرت علامہؒ کی تحریریں آسانی سے مل سکتی ہیں۔

محترم [illegible] نے اپنے پیش لفظ میں حضرت علامہ کے بعض ایسے مضامین کی نشان دہی کی ہے جو انہیں تلاش بسیار کے باوجود مل نہیں سکے۔ انہوں نے اپنے قارئین سے درخواست کی ہے کہ وہ ان کی تلاش اور حصول میں ان سے تعاون کریں تاکہ انہیں کسی آئندہ مجموعہ میں شامل کر لیا جائے۔

کتاب سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ ضخامت ۳۸۰ صفحات۔ مجلد کی قیمت پندرہ روپے۔
ملنے کا پتہ — شیخ محمد اشرف، کشمیری بازار۔ لاہور۔

۲۔ روحِ اسلام ۔ اقبال کی نظروں میں

حیدرآباد (دکن) کے ارباب علم و بصیرت کو علامہ اقبالؒ سے بڑی عقیدت رہی ہے اور اسی بنا پر وہاں سے علامہ کے پیغام اور زندگی سے متعلق اچھی اچھی کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ حیدرآباد پر جو کچھ بیتی ہے اس کے بعد وہاں اس قسم کی دلچسپیاں کہاں باقی رہی ہوں گی لیکن ڈاکٹر غلام عمر خاں صاحب کے زیر نظر کتابچہ نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ ——— بجلیاں بسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں۔ یہ درحقیقت اس "مردِ قلندر" کے فیضانِ نظر کا اثر ہے جو وہاں ——— ڈاکٹر سید عبداللطیف کے پیکر میں متشکل آرہا ہے۔ چنانچہ اس کا اعتراف و اظہار کتاب کے دیباچہ میں موجود ہے۔ کتاب میں روحِ اسلام اُس قوت ۔ توانائی اور جلال کو قرار دیا گیا ہے جس کے سہارے زندگی قائم ہے۔ اور آگے بڑھتی اور بلند ہوتی ہوئی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے ——— اور یہ بالکل صحیح ہے۔ یہی قرآن کی تعلیم ہے جسے علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا۔ کتاب مختصر ہے لیکن معنویت کے اعتبار سے اس میں بڑا ارتکاز ہے۔ نیٹشے کی فکر کے ساتھ تقابل اس کا خصوصی موضوع ہے اور جن مقامات پر اس نے ٹھوکر کھائی ہے ان کی عمدگی سے نشاندہی کی گئی ہے۔

لیکن اس قدر صحتِ نظر کے باوجود محترم مصنف، ذرائع علم کے بارے میں اُسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں جس میں وہ حضرات گرفتار ہیں جو شعوری طور پر تو تصوف کو "اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا" قرار دیتے ہیں لیکن ان کے تحت الشعور میں تصوف بدستور کروٹیں لے رہا ہے۔ تصوف کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ انسان کے پاس عقل و فکر کے علاوہ ایک اور ذریعۂ علم بھی ہے جسے "قلبی تجربہ" کہا جاتا ہے۔ اس عقیدہ کو تسلیم کر لینے سے آپ اُسی تصوف کو اپنے صحنِ قلب میں پیوست کر لیتے ہیں جسے آپ شعوری طور پر اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا قرار دیتے ہیں۔ قرآن کی رُو سے علم کے دو ہی ذرائع ہیں۔ ایک وحی جس کا سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذات پر ختم ہو گیا۔ اور دوسرا عقل و فکر یا ادراک۔ اب انسان کے لئے صحیح راہ فقط ایک ہے اور وہ یہ کہ وہ وحی (قرآن کریم) کی روشنی میں اپنی عقل و فکر سے کام لے۔

لیکن ڈاکٹر عمر خاں صاحب اقبال کا یہ شعر درج کرتے ہیں۔

> بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے ——— وہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں۔

اور اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

> اندیشہ، عقل و فہم کی استعداد ہے جس کے ذریعے آفاق کا علم ممکن ہے۔ اور یہ خود دو بنیادی شاخوں پر مشتمل ہے۔ طبعی علوم اور تاریخ۔ اور انفس کا علم، استعداد قلب، عشق یا "جنوں" کی بدولت ہے جو عقل و فکر سے ایک

علیحدہ استعداد ہے۔ (ص ۳۲)

اس کے بعد اسی نکتہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک نارخوری "فطرت کی قوتوں کی تسخیر ہے جو عقل کے ذریعے ممکن ہے۔ اور

نورخوری اقلیم قلب کی ضیا پاشی ہے جس کی یافت قلبی تجربہ کے ذریعے ممکن ہے۔

ہم محترم مصنف سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا قرآن کریم نے کہیں بھی قلبی تجربہ کو ذریعۂ علم قرار دیا ہے؟

بہرحال اس قسم کے تسامح سے قطع نظر مصنف نے پیامِ اقبال کو نہایت اچھے پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اسے انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز، حیدرآباد (بھارت) نے شائع کیا ہے۔ قیمت اس کی ۲/- روپے ہے۔

۳۔ آیاتِ فطرت

چھوٹے سائز کے ۳۲ صفحات کا یہ کتابچہ ہمیں مدراس (بھارت) سے موصول ہوا ہے۔ ایک تو بھارت پھر اس میں بھی مدراس ہم حیران تھے کہ وہاں سے اردو کی کوئی تصنیف کیسے شائع ہو گئی۔ یہی حیرت کچھ کم نہ تھی لیکن جب ہم نے اس کتابچہ کی زبان کو دیکھا تو اس حیرت کی فراوانی کا پوچھنا نہیں۔ اس کے مصنف ہیں دانش فرازی صاحب انہوں نے نظم میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر لکھی ہے۔ لیکن یہ نظم سورۂ فاتحہ کی تفسیر نہیں بلکہ قرآنی تعلیم کے مختلف نکات کی تشریح کی کوشش ہے۔ پیرایۂ بیان کا انداز ملاحظہ فرمائیے۔

خدا نے پیکرِ آدم کو جب کیا پیدا۔ حضورِ حق یہ فرشتوں نے بیادب کہا۔
نگارخانۂ ہستی کے کارسازِ جلیل۔ ہمارے لب پہ ہمیشہ ہے تیرا ذکرِ جمیل
مگر یہ پیکرِ اضداد۔ ہاں یہ خاک نژاد۔ تیری زمیں پہ پھیلائیگا غبارِ فساد

پھر ابلیس کے متعلق ہے۔

گروہ شعلۂ جوالہ آتشیں پیکر۔ وہ فتنہ کوش حریفِ سکونِ جسم بشر
غرور کیش۔ تکبر سرشت۔ سرکش شعار۔ اٹھا۔ اور اللہ کے کہا اے خدائے لیل و نہار

سرزمینِ مدراس سے اس قسم کی زبان اور ایسا اندازِ بیان۔ در خود ہزار تبریک ہے۔

لیکن ہم جناب دانش کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ وہ قرآن کریم کی تفسیر نظم میں نہ ہی لکھیں تو بہتر ہے

اس میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں اور بڑی خامیاں رہ جاتی ہیں۔ وہ اپنی خداداد استعداد کو قرآنی مقاصد کے لئے صرف کرنا چاہتے ہیں تو اس کے مطالب نثر میں بیان کریں۔ اس سے اچھے نتائج مرتب ہوں گے۔ یہ کتاب (جسے پمفلٹ کہنا چاہیئے) کے۔ ایم۔ نثار صاحب نے ۳۴/۳۲۔ پی۔ اے۔ میتری اسٹریٹ۔ بڑی سیٹ۔ مدراس ۱۳ سے شائع کی ہے۔ قیمت اس کی ایک روپیہ ہے۔

پیامبر (انگریزی)

زین العابدین راہنما ایران کے مشہور صحافی اور سیاست دان ہیں۔ انہوں نے آج سے کچھ عرصہ پہلے نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ پر ایک کتاب (فارسی زبان میں) لکھی تھی جو تین جلدوں میں شائع ہوئی تھی پہلی جلد ۱۹۳۷ء میں، دوسری ۱۹۵۱ء میں اور تیسری ۱۹۵۳ء میں۔ اس میں انہوں نے جو اندازِ بیان اختیار کیا وہ تاریخی سے زیادہ افسانوی تھا، اور جیسا کہ اس انداز کا تقاضا ہوتا ہے، انہوں نے حقائق سے زیادہ لطائف اور تاریخی شواہد سے زیادہ تخیلاتی مناظر سے کام لیا۔ نتیجہ یہ کہ کتاب "داستاں گوئی کے نقطۂ خیال سے تو دلچسپ ضرور ہو گئی لیکن حقیقت نگاری سے بہت دور چلی گئی۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ ایک مغربی اہلِ قلم "ایلول سٹن" نے اسے انگریزی کا جامہ پہنانے کے لئے منتخب کیا۔ اس کی پہلی جلد ہمارے زیرِ نظر ہے جسے شیخ محمد اشرف پبلشر کشمیری بازار لاہور نے خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے۔ قیمت اس کی پندرہ روپے ہے۔ یہ جلد حضورؐ کی پیدائش سے قبل سے لیکر آغازِ دعوت تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ ہمارے نزدیک سیرتِ طیبہ سے متعلق کتابیں حقائق پر مشتمل ہونی چاہئیں، اور حقائق بھی وہ جن کی تائید حضورؐ کی قرآنی سیرت سے ہوتی ہو۔ افسانوی اندازِ بیان میں پیش کردہ سیرت، اس عظمت و رفعت کی آئینہ دار نہیں ہو سکتی جس کا پیکر وہ ذاتِ اقدس و اعظم تھی۔ مغربی ممالک تو سیرتِ طیبہ سے متعلق اس قسم کی کتابوں کی ضرور حوصلہ افزائی کریں گے لیکن ہمیں ان کی اشاعت میں احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ اسی احتیاط کی ضرورت کو اجاگر کرنا مقصود تھا جس کے لئے علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو بیان کیا تھا کہ

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لئے

دین میں (جس کا ایک اہم گوشہ حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ ہے) زیبِ داستاں کے لئے اضافوں کا کوئی کام نہیں۔ انہی اضافوں نے تو دین کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

الرسائل القُشیریہ

امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القُشیریؒ چوتھی صدی ہجری کے ایک صوفی بزرگ تھے جو نیشاپور کے قریب پیدا ہوئے۔ انہوں نے کچھ رسائل لکھے تھے جو نایاب تھے۔ ان میں تین رسالے استنبول کے کتب خانوں سے دستیاب ہوئے ہیں جنہیں ادارہ تحقیقات اسلامی (کراچی) نے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ایک رسالہ اشاعرہ کی تائید میں ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ان کے عقاید وہی ہیں جو جمہور اہل سنت کے ہیں۔ دوسرا رسالہ السماع ہیں سماع کے آداب وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ اور تیسرا رسالہ سلوک کی منازل سے بحث کرتا ہے۔ ادارہ مذکور نے ان رسائل کو ایک جلد میں خوبصورت ٹائپ میں عمدہ کاغذ پر شائع کیا ہے۔ جلد بھی مضبوط اور خوبصورت ہے۔ قیمت فی جلد دس روپے۔

یہ تو رہی اس کتاب کی صوری حیثیت۔ معنوی لحاظ سے اس میں کس قسم کی تعلیم ملتی ہے اس کا اندازہ ذیل کی چند ایک مثالوں سے لگائیے۔

(۱) کچھ روایات درج کرنے کے بعد لکھا ہے۔

> اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب تک روح لوٹ کر میت میں نہ چلی جائے میت کو کسی بات کا علم نہیں ہو سکتا۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نبیؐ قبر میں زندہ ہیں (صـ۱۲)

اس کے بعد ایک اور روایات درج ہے جس میں کہا گیا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

> جس رات مجھے معراج کرائی گئی میں سرخ ٹیلے کے قریب حضرت موسےٰؑ کے پاس پہنچا تو وہ قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے (صـ۱۲)

آگے چل کر شب معراج کے سلسلہ میں وہ روایات درج ہیں جو عام طور پر قصہ گو واعظ سناتے اور دھراتے رہتے ہیں۔ اور ان سے بتانا یہ مقصود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

> انبیاء علیہم زندہ ہیں اور اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں (صـ۱۶)

ایک اور روایت ملاحظہ فرمایئے۔

> حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کو اس کے اعمال نجات نہیں دلا سکتے۔ صحابہؓ نے عرض کیا' کیا آپؐ کو بھی۔ فرمایا: ہاں مجھے بھی۔ البتہ اگر اللہ مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ لے تو۔ (صـ۲۳)

ایک اور روایت درج ہے۔ کہ حضورؐ نے فرمایا

> اللہ تعالےٰ نے یحییٰ علیہ السلام کو اپنی والدہ کے بطن میں ہی مومن پیدا کیا تھا اور

فرعون کو اپنی ماں کے بطن میں کافر پیدا کیا گیا تھا۔ (ص ۲۵)

یہ اقتباسات پہلے رسالہ کے تھے۔ دوسرے رسالہ میں ایک جگہ لکھا ہے۔

> سماع کی شرائط میں ایک شرط اسماء و صفات کا جاننا ہے تاکہ سامع کو معلوم ہو کہ کونسی صفت، صفتِ ذات میں سے ہے اور وہ کونسی صفت ہیں جو افعال و مخلوقات کا حق ہیں ...... اہل علم کی زبانی یہ وہ شرائط ہیں جن سے سماع کا سننا درست ہو سکتا ہے۔ مگر اہل حقائق کی زبانی۔ تو ان کے ہاں سماع کی شرائط یہ ہیں۔ اولاً صدق مجاہدہ کی وجہ سے نفس کا فنا ہو جانا۔ پھر روح المشاہدہ کے ذریعے سے دل کا زندہ ہو جانا وغیرہ۔ (ص ۲۱)

ایک جھلک، منازل سلوک کی بھی دیکھ لیجئے۔ لکھتے ہیں،

> پھر انسان کبھی اپنے "سر" میں کلام سنتا ہے جو بذات خود سوال و جواب کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس میں بندے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بندہ یوں محسوس کرتا ہے گویا وہ سو رہا ہے۔ اور یہ کلام حقیقی کلام نہیں ہے۔ مگر اسے یقین یہی ہوتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے ...... اسی وجہ سے تو کہنے والا یوں کہہ گیا۔ انا الحق۔ اور ابو یزید نے کہا۔ سبحانی۔ یہ الفاظ خود حق تعالیٰ نے فرمائے تھے کیونکہ حق تعالیٰ شخصیتوں کا امتیاز بھی مٹا دیتا ہے۔ (ص ۲۶)

ذرا اور آگے بڑھئے۔ فرماتے ہیں۔

> جب کرامات کے ظہور کا وقت آتا ہے تو ذکر کی حالت میں مجھ پر کچھ ایسے امور آتے جنہیں میں زنا سے بھی بدتر سمجھتا ہوں۔ (ص ۳۲)

غرضیکہ تینوں رسائل اسی قسم کے "حقائق اور نوادرات" سے معمور ہیں۔

ادارہ تحقیقات اسلامیہ کا وجود آئین پاکستان (۱۹۷۳ء) کی رو سے عمل میں لایا گیا تھا۔ اس کے اغراض و مقاصد آئین کی آرٹیکل ۲۳۰ میں یوں بیان کئے گئے ہیں۔

> اس ادارہ کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ اسلامی (علوم) اور تعلیم کی ریسرچ اس مقصد کیلئے کرے کہ (اس کی تحقیقات کے نتائج) معاشرہ کو صحیح اسلامی خطوط پہ تشکیل کرنے میں ممد و معاون ہو سکیں۔

ہم ادارہ موصوف سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے ان رسائل کی اشاعت سے (جس پر یقیناً کافی روپیہ صرف ہوا ہوگا)

جو تحقیق ذہنی قربانی ہے اس سے ہمارے معاشرہ کو صحیح اسلامی خطوط پر از سرِ نو تعمیر کرنے میں کونسی مدد ملے گی؟ کیا اس تعلیم کی رُو سے معاشرہ کی تشکیل صحیح اسلامی بنیادوں پر ہوگی یا جو کچھ تھوڑے بہت صحیح اسلامی تصورات کہیں کہیں ذہنوں میں محفوظ ہیں، وہ بھی ان توہمات اور تشکیکات کی نذر ہو جائیں گے! حقائق کی دنیا میں ایک وضعی حدیث کی سند سے یہ تعلیم کہ

> انسان کی نجات، اس کے اعمال کی رُو سے نہیں ہو سکتی!

کیا یہ اسلام کی تعلیم ہے یا سینٹ پال کی صدائے بازگشت جس نے کہا تھا کہ

> تم کو ایمان کے وسیلے ہی سے نجات ملی ہے اور یہ تمہاری طرف سے نہیں۔ خدا کی بخشش ہے۔ اور نہ اعمال کے سبب سے۔

اور

> انسان شریعت کے اعمال کے بغیر ایمان کے سبب سے راستباز ٹھہرتا ہے۔

اور لطائف کی دنیا میں یہ شاعری کہ انا الحق کے الفاظ منصور کے نہیں خود حق تعالےٰ کے تھے کیونکہ وہ شخصیتوں کے امتیاز کو مٹا دیتا ہے۔ کیا یہ قرآن کی تعلیم ہے یا "ہم یہ ہم" "میں ہی یہ جا ہوں" کی ویدانتی کلیان!

اور اگر اس سے مقصود یہ تھا کہ یہ نایاب رسائل محفوظ ہو جائیں تو اس فریضۂ مقدسہ کو محکمۂ اوقاف کے سپرد کر دینا چاہئے تھا جو گڑے مردے اکھیڑنے اور انہیں ممی کر کے محفوظ رکھنے اور کعبہ سے نکالے ہوئے بتوں کو جھاڑ پونچھ اور بنا سنوار کر ملت کے حریمِ قلب میں بسانے کے کاموں میں خدا کے فضل سے کافی مہارت حاصل کر چکا ہے۔ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ ان کاموں کے لئے وجود میں نہیں لایا گیا۔

کس قدر مقامِ تاسف ہے کہ ہمارے جو ادارے حسنِ انتظام کے ساتھ نکیرِ معاشرہ سے آزاد ہو کر ملت کی تشکیلِ جدید کے بلند مقصد کے لئے وجود میں آتے ہیں، وہ اس قسم کے کھیل تماشوں میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔

وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا

دعوتِ اسلام

علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر، مولانا شبلی مرحوم کے فرانسیسی زبان کے استاد اور عربی زبان کے شاگرد۔ علامہ اقبال کے استاد، پروفیسر سر طامس آرنلڈ نے ۱۸۹۶ء میں پریچنگ آف اسلام کے نام سے انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھی تھی جس نے ہندوستان اور یورپ دونوں ممالک میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ کتاب کا موضوع یہ تھا کہ یہ غلط ہے کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا تھا۔ یہ اپنے مواعظِ حسنہ اور اس کے پیش کرنے والوں کے اخلاقِ حمیدہ کے زور

سے پھیلا تھا۔ اس سلسلہ میں پروفیسر آرنلڈ نے جسقدر محنت اور تحقیق کی تھی وہ فی الواقعہ مستحقِ ستائش تھی۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جس میں اسلام کے پھیلنے کا تاریخی ذکر اس کتاب میں نہ آگیا ہو۔ اس سلسلہ میں انہیں جس قدر محنت کرنی پڑی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جن قلمی یا مطبوعہ کتابوں کے حوالے اس کتاب میں آتے تھے ان کی فہرست، باریک ٹائپ کے بارہ صفحات پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور ان میں اردو۔ فارسی۔ عربی کے علاوہ، یونانی اطالوی انگریزی۔ ہسپانوی۔ پرتگیزی زبانوں کی کتابیں شامل تھیں۔ تقریب نو دس برس میں یہ کتاب مرتب ہوئی تھی۔ سرسیدؒ اس کتاب سے اسقدر متاثر تھے کہ انہوں نے اسی زمانے میں مولوی محمد عنایت اللہ دہلوی (مرحوم) سے اس کا اردو ترجمہ کرایا۔ یہ ترجمہ سنہ ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اب اسی ترجمہ کو مسعود پبلشنگ ہاؤس بلاسس اسٹریٹ کراچی سے شائع کیا ہے۔

اس کتاب کا جسقدر تعارف اوپر کرایا گیا ہے، اس کے بعد ہم سمجھتے ہیں کہ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تحقیق مزید کے بعد کتاب میں مندرج کسی تاریخی واقعہ میں کوئی قدح نظر آجائے۔ یا اسلامی جنگوں کے فلسفہ کے متعلق کسی شق میں، یا بزرگوں کی طرف منسوب کردہ بعض کرامات کے متعلق اختلاف کیا جا سکے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی اس میں جس قدر معلومات فراہم کی گئی ہیں اور جس ترتیب سے انہیں پیش کر کے ناظرین کو اس نتیجہ پہ پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام بزورِ شمشیر نہیں پھیلا اس نقطۂ نگاہ سے یہ کتاب اب تک بھی اپنی مثال آپ ہے۔

کتاب متوسط تقطیع کے ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور مجلد کی قیمت نو روپے ہے۔

کراچی میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن :- ہر اتوار کی صبح، ٹھیک نو بجے حسبِ معمول سندھ اسمبلی ہال میں بذریعہ ٹیپ شروع ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریکِ درس ہو کر اس حقیقت کو سمجھئے کہ قرآن انسانی زندگی کے الجھے ہوئے مسائل کا کس قدر واضح اور نکھرا ہوا حل پیش کرتا ہے۔

نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی

لاہور میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن :- ہر اتوار کی صبح۔ ساڑھے نو بجے ۲۵/بی گلبرگ میں شروع ہوتا ہے۔

(نمائندہ بزم لاہور)

تحقیق سید و سادات

مغرب میں جس قسم کے محققین کو "ریسرچ اسکالرز" کہا جاتا ہے ہمارے ہاں آجکل کے معروف اہلِ قلم حضرات میں علامہ تمنا عمادی اور محترم محمود احمد عباسی صاحب کے نام ان میں سرِفہرست لکھے جانے کے قابل ہیں اول الذکر کا میدان نقدِ روایات ہے اور ثانی الذکر کا نقدِ تاریخ ——اگرچہ روایات میں خود تاریخ بھی آجاتی ہے اور ہماری تاریخ میں روایات بھی۔ عباسی صاحب نے زیرِ نظر تالیف میں یہ تحقیق کیا ہے کہ سید کا لفظ جو ہمارے ہاں حضرت علیؓ کی اس اولاد کے لئے بولا جاتا ہے جو حضرت فاطمہ الزہراؓ کے بطن سے ہو —— اور اس کا سلسلہ اسی طرح آگے چلا آرہا ہے۔ ابتدائے اسلام میں یہ لفظ اس نسبی خصوصیت کے لئے کہیں استعمال نہیں ہوا۔ نہ ہی اس زمانے میں کوئی نسبی رشتہ باعثِ تفوق سمجھا جاتا تھا کیونکہ قرآن کریم نے فضیلت کا معیار تقویٰ قرار دیا ہے نہ کہ کسی کے ساتھ نسبی نسبت۔ کتاب کا محوری موضوع تو یہی ہے لیکن جیسا کہ علامہ تمنا صاحب اور عباسی صاحب کی تالیفات کا عام انداز ہے، اس میں ضمناً متعدد دیگر اہم نکات سامنے آگئے ہیں اور ان کے سلسلہ میں بے شمار معلومات فراہم کر دی گئی ہیں، اس اعتبار سے کتاب تاریخی جرح و تنقید کا صحیح ذخیرہ اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ اور مجلد کی قیمت آٹھ روپے ہے۔ جو زیادہ نہیں۔ یہ الفاظ (کہ قیمت زیادہ نہیں) ہمیں اس لئے لکھنے پڑے کہ ہمارے ہاں کتاب کی قیمت کا موازنہ کرتے وقت صرف اس کی ضخامت، کاغذ اور جلد کو دیکھا جاتا ہے۔ مصنف کی محنت اور کاوش کسی حساب و شمار میں نہیں ہوتی۔ ورنہ اگر اسے بھی سامنے رکھ لیا جائے تو پھر اس کتاب کی یہ قیمت کچھ بھی نہیں۔ کتاب مکتبہ محمود ۱۲۹ بی ایریا، لیاقت آباد، کراچی کی طرف سے شائع ہوئی ہے لیکن لاہور میں مکتبۂ علم و حکمت سوتر منڈی سے مل سکتی ہے۔

(THE DELUSION OF GRANDEOR)

جس زمانے میں قادیانیت کے خلاف بہت کچھ لکھا جایا کرتا تھا، امرتسر کے ایک طبیب (غالباً محمد علی نامی) نے "سودائے مرزا" کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ اس میں انہوں نے مرزا صاحب کے دعاوی کے مسئلہ کا جائزہ ایک نئے انداز سے لیا تھا۔ انہوں نے طبِ قدیم کی رُو سے جنون کی ایک خاص قسم بتائی تھی جس میں مریض اس وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اسے خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے (سائیکلوجی میں اسے RELIGIOUS-MANIA کہتے ہیں)۔ اس کے بعد انہوں نے مرزا صاحب کی تحریروں کا حوالہ دیکر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ان میں اس مرض کی علامات پائی جاتی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب کے مصنف مسٹر ایم ۔ آر ۔ خان نے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا جائزہ اسی نقطۂ نگاہ سے لیا ہے ۔ انہوں نے علم النفس (سائیکلوجی) کے ماہرین کی تحقیق سے یہ بتایا ہے کہ ایک خاص قسم کا نفسیاتی مرض ہوتا ہے جس میں مریض اس وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ دنیا میں بہت بڑا آدمی ہے اور اس کی مثل کوئی اور نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے مودودی صاحب کی تحریروں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان میں اس مرض کی علامات پائی جاتی ہیں ، اس لیئے وہ نفسیاتی مریض (PSYCHOLOGICAL - CASE) ہیں ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ملک کے کوئی ماہر علم تجزیہ نفس ان خطوط پر مزید تحقیق کریں تو ممکن ہے "قوم" مسئلہ مودودیت " کی الجھن سے نکل جائے اور یہ تحقیق خود مودودی صاحب کے لیئے بھی مفید ثابت ہو ۔

کتاب بڑی دلچسپ ہے اور اس کی ابتدا مصنف کی مودودی صاحب کے ساتھ پہلی ملاقات سے ہوتی ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ اس مجلس میں ایک مغربی لباس میں ملبوس نوجوان نے مولانا صاحب سے یہ سوال پوچھا تھا کہ

وقت دیکھنے کے لیئے گھڑی رکھنا اسلام میں جائز ہے یا نہیں

اس سیدھے سادے سوال کے جواب میں مولانا صاحب نے جو طول طویل منطقیانہ گفتگو کی وہ سننے کے قابل تھی ۔ جب اس نوجوان نے کہا کہ حضرت ! میرا سوال تو بڑا سیدھا سادہ اور صاف تھا ۔ اس کا جواب بھی دو ٹوک الفاظ میں صاف اور واضح ہونا چاہیئے ۔ تو مولانا صاحب نے انتہائی تقدس کے ساتھ فرمایا کہ عزیزم ! تم میری مشکلات کو نہیں سمجھتے ۔ تمہارے کاندھوں پر ذمہ داری کا وہ بوجھ نہیں جو میرے کندھوں پر ہے ۔ (ص ۱۴) ۔

کتاب میں مودودی صاحب کی تحریروں کے بے شمار اقتباسات اور حوالے ہیں اور انداز بیان شگفتہ اور دلچسپ ہے ۔ ضخامت دو سو صفحات ۔ کاغذ سفید ۔ طباعت روشن ۔ قیمت (بکس بورڈ کور) چار روپے ۔
شائع کردہ ۔ لاہور بک ہاؤس ۔ اورنگ زیب مارکیٹ ۔ کراچی ۔

بزمِ طلوع اسلام " لاہور چھاؤنی کے عام اجلاس ہر ماہ کے دوسرے اور چوتھے اتوار کو باقاعدگی سے منعقد ہوتے ہیں ۔ " طلوع اسلام " کی قرآنی تحریک کو سمجھنے کے لیئے ان اجلاس میں شرکت فرمائیے ۔ علاوہ ازیں مفکر قرآن محترم پرویز صاحب کی جملہ تصانیف کے مطالعہ کے لیئے بزم کی لائبریری سے استفادہ فرمائیں ۔

نمائندہ بزمِ " طلوع اسلام "
51 ۔ بکر محلہ ۔ لاہور چھاؤنی

بچوں کا صفحہ

کسی کے ہاں بلا اجازت نہ جاؤ

اصغر اور حمید کی دوستی اتنی پکی کہ اُن کے ہم جماعت اُن پہ رشک کرتے تھے۔ دونوں اکٹھے اسکول آتے۔ ایک ہی ڈیسک پر بیٹھتے۔ تفریح کے دوران بھی اکٹھے ہی کھیلتے اور جب چھٹی ہوتی دونوں مل کر گھر جاتے۔ آج تک انہیں کسی نے لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے استاد بھی اس دوستی کی وجہ سے اُنکی تعریف کرتے تھے۔ ایک دن حمید کو اکیلے اسکول آتے دیکھ کر اس کے ایک دوست نے پوچھا " آج اصغر تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟" مگر حمید نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے کمرے میں آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اصغر کلاس میں داخل ہوا۔ اُس کے چہرے سے اسکی پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ حمید کے برابر بیٹھتے ہی اُس نے پوچھا "حمید آج تم میرا انتظار کئے بغیر ہی گھر سے چلے آئے" حمید نے جواب دینے کی بجائے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اب تو اصغر کی بے چینی اور بھی بڑھ گئی۔ اُس نے حمید کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "آخر کچھ بتاؤ تو حمید! بات کیا ہے؟" حمید نے اپنا منہ اصغر کی طرف پھیر لیا اور

ساتھ ہی ایک طمانچہ اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا "آئندہ مجھ سے بات نہ کرنا" اصغر بھونچکا سا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں بہنے لگیں۔ تمام ہم جماعت دم بخود بیٹھے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اچانک ماسٹر صاحب کلاس میں داخل ہوئے سب لڑکے اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہوگئے اصغر ماسٹر صاحب کی آمد سے بے خبر اپنی جگہ پر بیٹھا روتا رہا۔ ماسٹر صاحب کی نگاہ اس پر پڑی۔ وہ اس کے قریب گئے اور کہا "اصغر کیا بات ہے۔ تم کیوں رو رہے ہو" ماسٹر صاحب کو دیکھ کر اصغر خاموشی سے اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا، اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ حمید بھی مغموم اور پریشان کھڑا تھا۔ ماسٹر صاحب نے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ارشد! کیا تم بتلا سکتے ہو کہ اصغر کیوں رو رہا ہے" "حمید نے اصغر کے منہ پر طمانچہ مارا ہے" ارشد نے جواب دیا۔ یہ سن کر ماسٹر صاحب کے دل پر ایک بجلی سی گری۔

انہوں نے حمید سے پوچھا "کیا ارشد ٹھیک کہہ رہا ہے حمید!؟" "جی ہاں جناب!" اور اس سے آگے حمید کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اب تو ماسٹر صاحب کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی اور انہوں نے حمید سے کہا "حمید سچ سچ بتاؤ بات کیا ہے!؟" "جناب کل شام میں اصغر کے مکان پر گیا اور اسے آواز دی۔ کافی دیر کے بعد اصغر نے دروازہ کھولا اور کہنے لگا "حمید تم اس وقت جاؤ۔ مجھے فرصت نہیں۔ کل ملونگا" اور پھر فوراً ہی دروازہ بند کردیا" حمید نے اتنا کہا اور خاموش ہوگیا۔ "تو اس میں ناراضگی کی کونسی بات تھی!؟" ماسٹر صاحب نے ذرا زور سے کہا "جناب مجھے اس رویہ پر بڑا صدمہ ہوا۔ میں اتنی دور سے اسے ملنے کے لئے گیا اور اس نے مجھے دھتکار دیا۔" حمید نے جواب دیا۔

اب ماسٹر صاحب اصل بات سمجھ گئے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ حمید اس بات سے ناراض تھا کہ اصغر نے اُسے اپنے مکان میں بٹھا کر اس سے باتیں کیوں نہیں کیں تا سکے بعد ماسٹر صاحب نے اصغر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ کل اُس کے ہاں اسکے ماموں اور ممانی آئے ہوئے تھے۔ جب حمید وہاں پہنچا تو گھر کے سب لوگ ان کے پاس بیٹھے کوئی ضروری مشورہ کر رہے تھے۔ اصغر کو اس کے والد نے کہا تھا کہ وہ بھی اُن کے پاس ہی بیٹھے۔ اور اُٹھ کر کہیں نہ جائے۔ یہ وجہ تھی کہ اس نے حمید کو گھر میں بٹھائے بغیر رخصت کر دیا۔ ماسٹر صاحب اب اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گئے اور کلاس کو مخاطب کر کے کہا۔ "بچو! قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب تم کسی کے مکان پر جاؤ اور صاحب خانہ تمہیں کسی وجہ سے یہ کہے کہ اس وقت معاف رکھئے پھر کبھی تشریف لائیے گا تو تمہیں خاموشی سے واپس لوٹ آنا چاہیئے۔

لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا ...... وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا .... (۲۴ / ۲۸، ۲۷)۔

تم اپنے گھر کے سوا دوسروں کے گھروں میں بلا اجازت داخل نہ ہو .... اور اگر وہ (کسی وجہ سے) کہہ دیں اس وقت معاف فرمائیے تو (دل میں بغیر کسی قسم کا ملال لائے بغیر) واپس آجایا کرو۔

بچو! حمید کا اصغر سے محض اس وجہ سے ناراض ہو کر طمانچہ مارنا کہ اُسے اصغر نے گھر میں بٹھایا کیوں نہیں، اچھی بات نہیں۔ حمید نے سخت نادانی کی ہے"۔ ماسٹر صاحب یہ کہکر خاموش ہو گئے۔ حمید اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے پاس آکر خاموشی سے

کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ "ماسٹر صاحب میں شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دیجیے" ماسٹر صاحب نے پیار بھرے لہجے میں کہا "حمید! تمہیں اصغر سے معافی مانگنی چاہیئے تم نے اس کا دل دُکھایا ہے" حمید جھکی ہوئی نگاہوں سے اصغر کے پاس گیا اور کہنے لگا۔ "اصغر بھیا مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے بڑی بھول ہوگئی۔ میں بہت شرمندہ ہوں" اصغر نے اٹھ کر حمید کو گلے لگا لیا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے بہہ نکلے۔ یہ خوشی اور مسرت کے آنسو تھے۔ ماسٹر صاحب بہت خوش ہوئے اور دونوں کو شاباش دی۔

(ظفر عبّاس قریشی)

کراچی میں ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات

کراچی میں ادارہ کی شائع کردہ کتب، پرویز صاحب کی مطبوعات اور تحریک کا لٹریچر حسبِ ذیل پتہ سے مل سکے گا۔
محمد اسلام صاحب نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ ۴/۱۰۰۔ لوگس روڈ۔ نیو ٹاؤن۔ کراچی۔
علاوہ بریں ہر اتوار کی صبح کو سندھ مدرسہ اسمبلی ہال (بندر روڈ) میں پرویز صاحب کے درسِ قرآن کے موقع پر بھی تحریک کا لٹریچر حسبِ ضرورت مہیا کیا جاتا ہے۔

ضروری اعلان!

جن احباب کا سالانہ چندہ فروری ۱۹۶۵ء کی اشاعت کے ساتھ ختم ہوگیا تھا انہیں ایک پرانا پرچہ بذریعہ وی۔ پی بھیجنے کے انتظامات کئے جارہے تھے کہ محکمہ ڈاک کے پوسٹ مینوں کی ہڑتال شروع ہوگئی۔ اس لئے وی۔ پی ارسال نہیں کی جاسکیں۔ ہڑتال ختم ہونے پر ان تمام احباب کو وی۔ پی بھیجدیئے جائیں گے۔ (ناظم ادارہ) ۱۸ فروری ۱۹۶۵ء